ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلٰى رَبِّهٖ مَآبًا

مدح

حضرت خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہٗ

الموسوم بہ

راہِ فراد

از کلام

شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن

مرحوم و مغفور مع شرح فارسی از حضرت خواجہ علی محمد شاہ

صاحب چشتی نظامی فخری مدظلہ العالی

سجادہ نشین بسی نو شریف ساہیوال پاک پتن شریف

فخر جہاں اکادمی گیمبر اڈا انور شاہ موڑ ضلع ساہیوال
0345-7526926

ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا

مدح

حضرت خواجہ بزرگ اجمیری قدس سرہٗ

الموسوم بہ

راہِ فدا

از کلام

شیخ غلام قادر گرامی شاعرِ خاص حضور نظام دکن
مرحوم و مغفور مع شرح فارسی از حضرت خواجہ علی محمد شاہ
صاحب چشتی نظامی فخری مدظلہ العالی
سجادہ نشین بسی نو شریف حال پاک پتن شریف

صاحبزادہ حافظ محمد طیب فرید ناظم مکتبہ چشتیہ فریدیہ
نور شاہ موڑ گیمبر اڈا ضلع ساہیوال۔
فون: 0345-7526926، 0301-6985585

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بحق خواجہ گنج شکر۔۔ ہر بلا رد باشد

نام کتاب : راہِ فردا فارسی

مصنف : فرید العصر حضرت خواجہ

میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری

مترجم : ابوالبرکات اللہ دتہ فریدی نظامی

خصوصیاتِ راہِ فردا : ڈاکٹر صاحبزادہ محمد مظہر فرید شاہ

تقریظ : علامہ قاسم رضوی ایم اے

عرض ناشر : سائیں نذیر حسین فریدی

طباعت : بار چہارم اُردُو

پریس : فریدیہ پرنٹنگ پریس ساہیوال

کمپوزنگ : فیاض حسین (عزیز کمپوزنگ سنٹر ساہیوال)

0304-9220500

ناشر : فخر جہاں اکادمی گیمبر اڈا نور شاہ موڑ ضلع ساہیوال

ہدیہ : -/300 روپے

کتاب ملنے کے پتے: حضرت الحاج پروفیسر میاں مسعود احمد خاں صاحب

کوٹھی حضور میاں صاحب بسی شریف پاکپتن شریف

صاحبزادہ حافظ محمد طیب فرید

ناظم مکتبہ چشتیہ فریدیہ

نور شاہ موڑ گیمبر اڈا ضلع ساہیوال۔

فون :0345-7526926، 0301-6985585

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1

انتساب شرف

بحق خواجہ گنج شکر۔۔۔ ہر بلا رد باشد

بندہ اس قلمی کاوش کو عالی جناب حضرت الحاج صاحبزادہ

میاں محمود احمد خان صاحب چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

سجادہ نشین فرید العصر

حضرت خواجہ الحاج میاں علی محمد خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

پیر صاحب بسی شریف کے نام نامی پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاک راہِ درد منداں

ابو طیب سائیں نذیر حسین فریدی

17 ربیع الثانی 1444ء

فہرست مضامین

راہِ فردا کے حواشی

☆☆☆☆

دیباچہ طبع دُوم

قطب الوقت، فرید العصر

حضرت خواجہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ط قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ رَبْعًا شَدِیْدًا مِنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا مَّا کِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا O (تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً Oوَالْکِبْرِیَاءِ لِلّٰہِ الْغَالِبِ عَلٰی اَمْرِہِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی عَبْدِہٖ قُرْاٰنًا عَزِیْزًاوَمِنْہُ (یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَھَا وَبَیْنَہٗ اَمَدًا بَعِیْدًاOوَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ط قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ O وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَوْلِیَائِہِ التَّابِعِیْنَ الَّذِیْنَ اِتِّبَاعَھُمْ مُوْجِبُ النَّجَاۃِ مِنْ عَذَابٍ مُّھِیْنٍO

(سب تعریف اس خدا کیلئے ہے کہ جس نے اپنے بندے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم پر کتاب اُتاری اور اس میں کوئی کجی نہ کی ورآں حالیکہ وہ دین

کو قائم رکھنے والے ہیں اور بالکل سیدھی سی بات ہے تاکہ عذاب شدید سے ڈر سنائے جو حق تعالیٰ کے پاس ہے اور ایمان والوں کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ان کے لئے اجر حسن (یعنی بہشت) ہے کہ جس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور بہت بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے عمل میں کون بہتر ہے۔ اور اس خدا کے لئے بڑائی ہے جو قادر مطلق ہے جس نے نازل کیا اپنے بندے پر قرآن غالب اور اس قرآن سے ہے (اس دن کو پیش نظر رکھو کہ جس دن ہر نفس (آدمی) اپنے نیک عمل کو رُو برو موجود پائے گا اور جو برائی کی اُس کو بھی پائے گا۔ چاہے گا کاش درمیان اس برائی کے اور درمیان اس شخص کے بہت دوری ہوتی اور ڈراتا ہے اللہ تم کو اپنے نفس (ذات) سے اور اپنے بندوں پر شفقت بھی رکھتا ہے کہہ دو اے پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو پیروی کرو میری کہ اللہ بھی تم سے دوستی رکھے (یعنی اگر میری پیروی کرو گے تو اللہ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا) اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۔ اے پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کہہ دو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی۔ پس اگر پھر جاویں (نہ مانیں اور رُوگردانی کریں) تو اللہ منکروں کو دوست نہیں رکھتا۔

اما بعد

بندۂ ذلیل اُمیدوار لُطفِ ربِ جلیل کمترین غلامانِ غلام قبلہ عالم

حضرت خواجہ میاں محمد شاہ صاحب چشتی نظامی فخری ہوشیار پوری علیہ الرحمہ کہتا ہے کہ میرے محترم ملک الشعراء شیخ غلام قادر صاحب گرامی نے ان چند اشعار کی شرح لکھنے کے لئے اس خاکسار کو فرمایا۔ پس باوجود کم بضاعتی اور بے علمی حق صحبت کو ملحوظ رکھ کر جو کچھ ذہن ناقص میں آیا ٹوٹی پھوٹی عبارت میں ادا کر دیا۔ چونکہ محبّ ممدوح فارسی زبان سے ایک خاص ذوق رکھتے ہیں لہٰذا بپاس خاطر آں بزبان ہر شعر کے تحت اس کی شرح بزبان فارسی تحت اللفظ لکھ دی گئی ہے اور جو کچھ چندابتدائی اشعار کا مضمون اوّل ادا کردہ معانی سے جداگانہ بوقتِ نظر ثانی سمجھ میں آیا وہ بھی بطور حاشیہ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ گر قبول اُفتذز ہے عزو شرف۔ مسودہ کی نظر ثانی کے سلسلہ میں اُستاذ محترم مولانا مولوی محمد مرید احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جو زحمت اُٹھائی اس کے لئے فقیر سپاس گزار ہے۔ نیز چند جگھوں پر جو نوٹ مولانا موصوف نے اضافہ فرمائے ہیں میں اُن کے لئے خاص طور پر شکر گزار ہوں۔

فقیر علی محمد کان اللہ لہٗ۔
سجادہ نشین بسی نو شریف، ضلع ہوشیار پور

☆☆☆

4
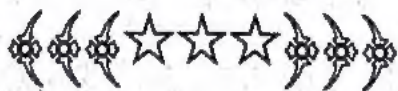
مقدمہ

از مولانا غلام قادر گرامی مرحوم و مغفور ہوشیار پوری

مندرجہ ذیل مقدمہ کتاب ''راہِ فردا'' کے لئے اس عظیم اور مقبول منقبت کے عزیز القدر مصنف حضرت مولانا غلام قادر گرامی مرحوم و مغفور، سابق شاعرِ خاص نظام دکن نے لکھا تھا اور اس عظیم الشان منقبت کی اس آفاقی شرح کی پہلی اشاعت میں چھپا تھا۔ اس بے مثل شرح کی پہلی اشاعت امرتسر سے ہوئی تھی۔ اشاعت ثانی دہلی سے ہوئی اور اب احباب کے شدید اصرار پر تیسری مرتبہ یہ کتاب پاکپتن شریف سے شائع کی گئی چوتھی مرتبہ اُردو ترجمہ کے ساتھ فخر جہاں اکادمی گیمبر اوکاڑاچھاؤنی کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ چونکہ یہ مقدمہ تاریخی حیثیت کا حامل ہے ہم اسے تبرکاً اس اشاعت میں شریک کر رہے ہیں۔ (سائیں نذیر حسین فریدی)

''شعرائے ہند نے حضرت قطب الاقطاب سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیری قدس سرہ کے قصائد لکھے۔ گرامی نے بھی چند شعر لکھے۔ گرامی کو درجہ اوّل تمغہ ملا۔ گویا یہ منقبت حضرت ہند الولی کے یہاں مقبول ہو گئی (جناب خلیق دہلوی نے اظہار سپاس کے لئے جو شذرہ سپرد قلم کیا تھا وہ دہلی سے شائع ہونے والے ایڈیشن کے آخر میں شامل تھا۔ چنانچہ اسی ترتیب سے اب بھی اسے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ اس سے گرامی کی لکھی ہوئی منقبت کی شانِ قبولیت واضح ہوتی ہے۔ حضرت قبلہ قطب زمان فرید العصر مولانا الحاج قبلہ میاں علی محمد شاہ صاحب سجادہ نشین بسی شریف حال پاک پتن شریف اس منقبت کے

اسرار و رموز کا عرفانِ کامل رکھتے ہیں۔ آپ نے کئی مجلسوں میں فرمایا کہ یہ شرح دہلی کے قیام کے دوران لکھی گئی۔ فرصت کے وقت ہم درگاہ شریف سے باہر جنگل میں نکل جاتے۔ اور یکسوئی کے عالم میں جتنی کچھ شرح مرتب ہوتی لکھ لیتے۔ یونہی جب پوری شرح مرتب ہو چکی تو مسودہ حضرت قطب الاقطاب خواجہ خواجگان حضرت خواجہ نصیر الدینؒ چراغ دہلی کے آستانہ مبارک پر حضرت کی پائنتی پر رکھ دیا گیا اور تین روز بعد گویا حضرت ممدوح سے شرف قبولیت پانے کے بعد چھپنے کے لئے دیا گیا۔ اصل منقبت تو حضرت خواجہ خواجگان جناب خواجہ بزرگ قدس سرہ العزیز کے یہاں شرفِ قبولیت پا ہی چکی تھی۔ یہ لاجواب شرح بھی خواجگان عظام کے فیض سے ہی معرض وجود میں آئی اور انہی سے سند قبولیت حاصل کرنے کے بعد شائع کی گئی۔

۲۔ اِس قصیدہ کی شرح حضرت سرخیل عارفاں میاں علی محمد خان صاحب سجادہ نشین بسی شریف ہوشیار پوری نے لکھی ہے۔ سبحان اللہ! بہت اعلیٰ درجہ کی شرح لکھی ہے۔ فارسی میں حضرت میاں علی محمد صاحب علم لدنی ہیں۔ لاجواب شرح لکھی ہے۔ میں اس شرح کو شائع کر رہا ہوں۔ اور میرے لائق، واجب التعظیم دوست عبداللہ منہاس امرتسری اس شرح کو طبع کرتے ہیں۔

۳۔ حضرت میاں علی محمد صاحب سجادہ نشین کی نسبت گرامی نے کچھ لکھا ہوا ہے۔ وہ بھی لکھتا ہوں۔

جانشین محمد است علیؒ   محرم نکتہ خفی و جلی

حضرت قبلہ عالم قطب الاقطاب العالم میاں محمد شاہ صاحب قدس اللہ سرہ العزیز اور حضور کے جانشین قبلہ مولانا الحاج قبلہ میاں علی محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ

علیہ کے بارے میں یہی حقیقت ثابت ہے۔

قدوۃ السالکین زبدۃ الواصلین حضرت خواجہ میاں محمد شاہ صاحب بسی نو ضلع ہوشیار پوراپنے زمانہ کے خضر راہ تھے۔ ان کے نواسے حضرت میاں علی محمدؒ خان صاحب ہیں۔ اور اِس شعر کے مصداق ہیں۔

باتوباشم درست شش دانگم بے تو باشم زآسیا بانگم
تو مرا دِل دہ و دلیری بین روبہ خویش خواں و شیری بین

حضرت میاں علی محمدؒ صاحب انسانِ کامل ہیں۔ ہوشیار پور کے ضلع میں ان کا فیض عام ہے۔ (گرامیؔ کا انتقال بروز جمعرات تین بجے صبح مورخہ 26۔ مئی 1927ء کو ہوشیار پور میں ہوا او وہیں قبرستان کندرا، شاہ بخاری میں دفن ہوئے)۔ ان کا یہ کہنا کہ حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا فیض ضلع ہوشیار پور میں عام ہے اس لحاظ سے تھا کہ گرامیؔ صاحب حضور میاں صاحب قبلہ کی خدمت میں اکثر و بیشتر ہوشیار پور ہی میں حاضر ہوتے رہے۔ ورنہ حضرت میاں علی محمد شاہ صاحب کا فیض عام برصغیر ہندو پاکستان کے تمام اطراف میں یکساں تھا۔ پنجاب، سرحد، سندھ ، بلوچستان، راجپوتانہ،حیدر آباد دکن یوپی اور سی پی بنگال وغیرہ ہر علاقہ میں حضرت فرید العصر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متوسلین کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ''اَللّٰھُمَّ زِدْفَزِدْ۔ آمین

(ا) حضرت قبلہ میاں علی محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مستجاب الدعوات ہونے کے بیشمار واقعات زباں زدِ خلائق ہیں۔ کئی ایک واقعات کا مجھے ذاتی علم و تجربہ ہے۔ وہ خاص واقعہ جس سے متاثر ہوکر بقول شیخ سردار محمد صاحب ہوشیار پوری، گرامی صاحب نے یہ قطعہ لکھا تھا کہ شیخ عنایت اللہ صاحب ہوشیار پوری کو

ایک مقدمہ میں پھانسی کا حکم سنایا جا چکا تھا۔ وہ مولانا گرامی کی برادری سے تھے۔ سب لوگ بشمول مولانا بہت فکرمند تھے۔ شیخ عنایت اللہ صاحب جو لاہور ہائی کورٹ میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور حضرت قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متوسلین میں سے تھے پاکپتن شریف میاں صاحب قبلہ کے پاس حاضر ہوئے۔ یہاں حضرت زبد الانبیاء شاہِ بحر و بر شیخ الشیوخ قطب عالم حضرت مولانا فرید الحق والدین خواجہ گنج شکر قدس سرہ العزیز کی بارگاہ اقدس میں حاضری کے وقت حضرت میاں صاحب قبلہ نے کچھ ایسے انداز سے دُعا فرمائی کہ شیخ عطاء اللہ صاحب کہتے تھے کہ مجھے معاً یقین ہو گیا کہ درحق اجابت دُعا کے لئے کھل چکا ہے۔ مولانا گرامی کو شیخ عنایت اللہ صاحب کی بریت کی اطلاع ملی تو فرمانے لگے ''میاں یہ رہائی حضرت میاں صاحب کی دُعاؤں کا اثر ہے۔ میاں علی محمد صاحب ''مستجاب الدعوات'' بزرگ ہیں۔

عام و خاص ان کے خوانِ معانی سے چاشنی گیر ہیں۔ ستر سالہ گرامیؔ نے ایسے سجادہ نشین مستجاب الدعوات کوئی نہیں دیکھے۔

مفتاح خزینہ ہائے سرمد این است | سجادہ نشین علی محمدؐ انیست
در حلقہ اولیا کہ سلک گہراست | در مرتبہ الماس وزبرجداین است

گرامی

﴾﴾﴾☆☆☆﴿﴿﴿

راہِ فردا کی چند خصوصیات

مفتی اعظم حضرت علامہ ڈاکٹر محمد مظہر فرید شاہ (پی ایچ ڈی)
مہتمم جامعہ فریدیہ ساہیوال

زیر نظر کتاب ''راہِ فردا'' دراصل فارسی زبان میں خواجہ خواجگان حضرت خواجہ غریب نواز خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حضور حضرت علامہ غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی لکھی ہوئی منقبت ہے۔ جس کی تشریح قدوۃ السالکین، عمدۃ العارفین، رہنمائے سالکاں، سرخیل چشتیاں و قطب الاقطاب فرید العصر حضور قبلہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ نے فارسی زبان میں تشریح کی اور جس کا اُردو ترجمہ حضرت علامہ مولانا ابوالبرکات محمد اللہ دتہ فریدی نظامی زید مجدہٗ فاضل جامعہ فریدیہ نے کیا اور اس کو قارئین حضرات کی مشکل کو آسان کر دیا ہے اور جسے مولانا سائیں نذیر حسین فریدی زید مجدہٗ کو چوتھی مرتبہ اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ''راہِ فردا کی بعض خصوصیات درج ذیل ہیں۔

۱۔ معنویت سے لبریز اور خوبصورت الفاظ کا انتخاب

۲۔ عوامی حلقوں کی اصلاح اور سالکین کی رہنمائی ہے

۳۔ عقائد اسلامیہ کی فصاحت اور اعمال کی ترغیب

۴۔ دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ اور آخرت کی اہمیت

۵۔ تصوف سے متعلق مشکل اصطلاحات کی آسان تعبیر

۶۔ فلسفیانہ موشگافیوں کی تسہیل

۷۔ فنا اور بقاء کی حقیقت کا اظہار

۸۔ حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فصوص الحکم سے متصوفانہ ابحاث کی توضیح

۹۔ اصلاحِ نفوس کے لئے قرآن و سنت کی توضیح

۱۰۔ حضرت شیخ غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مدعا کی بہتر تفہیم

۱۱۔ تعلیمات و عقلیات کی روشنی میں اشکالات کی تحلیل

۱۲۔ موقع و محل کے مطابق شگفتہ اور شائستہ اشعار کا استعمال

اگر زیرنظر کتاب کو بغور مطالعہ کیا جائے تو روح پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے مرشد کریم میرے والد گرامی حضرت علامہ ابوالنصر منظوراحمد شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ عنہ بانی جامعہ فریدیہ ساہیوال حضرت قبلہ فرید العصر میاں علی محمد خاں کے مرید خاص اور خلیفہ مجاز تھے ان شاء اللہ ان کے فیوض و برکات تا قیامت جاری رہیں گے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡم ط

حدیث دل

یہ اُس قصیدہ کی شرح ہے جو ملک الشعراء شیخ غلام قادر گرامی مرحوم نے حضرت سلطان الہند خواجہ خواجگان سیّدنا و مولانا خواجہ معین الدین حسن چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان میں کہی تھا۔ ایک تو ممدوح سلطان الہند خواجہ خواجگان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جنہیں بارگاہ رب العزت سے حبیب اللہ کا لقب ملا ہے۔ دوسرے ممدوح اپنے وقت کا بے مثل و یکتا شاعر ہے جس کو مبداء فیاض نے شاعری کی تمام حسن و خوبیوں سے بھرپور نوازا جس کا تقریباً سارا کلام آورد نہیں بلکہ آمد ہے جس میں فصاحت و بلاغت، جامعیت وغیرہ پورے کمال کے ساتھ موجود ہے اوراس پر مزید یہ کہ ان کے کلام میں صوفیاء کے بعض دقیق اور اہم مسائل کثرت سے ملتے ہیں اور کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ ہر صاحب ذوق سلیم سامع پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

شاعر مشرق محترم ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم گرامؔی کے بڑے مداح اور ان کے اشعار کے بے حد قدردان تھے۔ اوراُن کے بعض اشعار وجد وذوق کے عالم میں گھنٹوں پڑھتے رہتے تھے۔ جیسا کہ خود ان کے خطوط سے ظاہر ہے۔ اور جب گرامؔی کا انتقال ہوا تو انہوں نے چند اشعار بطور مرثیہ لکھے ۔ جس میں اُن کے فکر بلند اورطبع رسا کی دل کھول کر داد دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

آہ مولانا گرامؔی از جہاں بربست رخت　　آنکہ زد فکر بلندش آسماں راپشت پائے

معنی مستور آورد لفظ رنگینش نگر مثلِ حورِ بے حجاب اندر بہشتے دلکشائے

از نوائے جانفزائے اوعجم را زندگی جام جمشید از شراب ناب اُوگیتی نمائے

یاد ایامے کہ با اُو گفتگو ہا داشتیم اے خوشاخرمے کہ گوید آشنا با آشنائے

برمزارش پست ترکن پردہ ہائے سازرا تانہ گردد خواب اُو آشفتہ از شورِ نوائے

اِس پر نورٌ علی نور والی بات یہ کہ شیخ کبیر مرشد طریقت سیدی و مولائی حضرت خواجہ علی محمد شاہ چشتی نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اِس عظیم منقبت کی عارفانہ شرح لکھی۔ منقبت و شرح دونوں آپ کے سامنے ہیں ''مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں'' والی بات نہیں ہے بلکہ ذوقِ سلیم حکم ہے۔ اِس تیسرے ایڈیشن میں بعض احباب طریقت کے اصرار پر میں حضرت گرامیؔ مرحوم کی ایک غزل اور چند رباعیوں کی شرح شامل کر رہا ہوں۔ یہ سب کچھ حضرت سیّدی و مولائی میاں صاحب قبلہ کے اِرشادات ہیں جو آپ نے مختلف مجالس میں اِن اشعار کی شرح میں فرمائے ہیں۔ اَب میں آپ کے سامنے انہیں اختصار اور اس اعتراف کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ عین ممکن ہے مجھ سے حضرت کے ارشادات کی کماحقہٗ ادائیگی اور ان کے معنی کو ضبط تحریر میں لانے میں قصور واقعہ ہوا ہو جس کی ذمہ دار میری عقل ناقص اور علم نا تمام ہے۔

عام طور پر شعراء اپنے دیوان حمد باری تعالیٰ سے شروع کرتے ہیں۔ گرامیؔ مرحوم نے بھی حمد میں اشعار لکھے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

حرفے است خوش زحمد خدا بر زبانِ ما گرد و بگر دخویش زباں درد ہان ما

شعر کیا ہے گویا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کی تفسیر ہے۔ تمام تعریفیں، مستقل اور حقیقی طور پر صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ مخلوق کی صفات و خوبیاں

اضافی، عطائی اور اعتباری ہیں۔ قرآن پاک میں خود حضرت حق جل مجدہٗ کا ارشاد جزو یہ آیۃ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم شاہد ہے کہ وہ اپنی رحمت عامہ سے ہر کسی کو سب کچھ بلا معاوضہ عطا فرماتا ہے۔ قیام و بقا اُسی کے لئے ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ط وَ یَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ط غالب مرحوم نے کل مخلوق کی فنا اور بے ثباتی اور حضرت حق تعالیٰ کی بقا اور دوام کو بطور حمد اس طرح بیان کیا ہے جو واقعی لاجواب ہے۔ فرماتے ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

حضرت بیدل نے اپنی عارفانہ زندگی کو ''ہستی ماجز دروغ مصلحت آمیز نیست'' کہا ہے اور خوب کہا ہے لیکن گرامی نے تو غضب کر دیا۔ ملاحظہ فرمایئے شاخِ شعلہ پر وجود کا آشیانہ جو ہر لحظہ فنا کی آغوش میں ہے ناپائیداری اور فنا کا اِس سے زیادہ اور کیا عبرت انگیز اظہار ہوگا۔

بود ونبود ماہمہ ہیچ است اے حکیم یعنی بشاخِ شعلہ بود آشیان ما

ایک دوسری جگہ اپنی بے ثباتی کے ساتھ ساتھ حق کے سامنے اپنے پورے عجز کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک عقل نہیں کر سکتی۔ محدود لا محدود کو، مخلوق خالق کی ذات کو کسی طرح نہیں پا سکتا۔ انسانی عقل و خرد کی وسعت کتنی ہی کیوں نہ ہو پھر بھی اس کی حد ہے۔ خالقِ کائنات کا احاطہ عقل و ذہن کی حدود میں نہیں کیا جاسکتا۔ اکبر الہٰ آبادی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے۔

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

ملاحظہ فرمایئے گرامی نے اس رباعی میں کتنا اہم اور نازک مسئلہ کیسے

بہترین الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

دانستنِ ذات اُونہ حد بشراست زادراکِ صفات خود خبر بے خبراست
ازعین واثرچہ نکتہ ہامی رانی آں عین کہ عین می شناسی اثر است

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کو جاننا اور اُس کی ذات کا عرفان انسان کے بس کی بات نہیں لیکن اگر کوئی کہے کہ اُس کی صفات کے ذریعہ اُس کو پہچانا جا سکتا ہے تو یہ ایک خبر ہوگی جیسے انہ سمیع، انہ بصیر، انہ علیم۔ اور خبر میں احتمال سچ وصحیح یا نفی و اثبات دونوں ہمیشہ پائے جاتے ہیں۔ پہلوئے نفی تو ذات کی صفت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ذات کی صفات وجودی ہوتی ہیں۔ عدمی نہیں ہو سکتیں۔ اب رہا پہلوئے اثبات جو ذات کی صفت ہے تو یہ ایک خبر ہی ہے جو احتمال لے کر لوٹ پھیر کر تیری ہی طرف آتی ہے اس لئے کہ نفی و اثبات کا تعلق تیرے ساتھ ہے وہ ذات تک پہنچتی ہی نہیں۔ جب حالت یہ ہے تو پھر ذات کا علم و عرفان کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ عین واثر کا قیاس باندھ کر ہم ذات کا علم حاصل کر سکتے ہیں تو یہ قیاس بھی باطل ہے۔ اس لئے کہ جس کو تو عین سمجھ رہا ہے وہ تو ذات کی الوہیت ہے۔ جو خود اثر ذات ہے عین کہاں ہے۔ یہی تیرے قیاس کا بطلان ہے کہ تو نے اثر کو عین سمجھ لیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ذات کا عرفان ناممکن ہے کیونکہ وہ متعلق الوہیت ہے۔ متعلق ذات نہیں ہے ذات سے متعلق دیدار ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم حضرت شیخ اکبرؒ نے فتوحاتِ مکیہ کے دیباچہ میں یہی دلیل دی ہے۔ اس رباعی میں حضرت گرامی کا یہ کمال بالکل ظاہر ہے کہ انہوں نے اس بڑے مسئلہ کو چار مصرعوں میں ادا کر دیا۔

میں یہاں ایک رباعی اور پیش کرتا ہوں جس میں انہوں نے نہایت قادرالکلامی کے ساتھ عبودیت کا ملہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ علمائے صوفیا کے نزدیک عبادت و بندگی کی تعریف یہ ہے کہ بندہ انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنی اطاعت کا اظہار کرے۔

یک قطرہ زخمخانہ رازم دا دی   یعنے خبر از ناز و نیازم دا دی
صورت بند و چگونہ عصیاں ازمن   کز صورت خویش امتیازم دا دی

جس وقت یہ رباعی سجادہ نشین بسی شریف سیّدی و مولائی حضرت خواجہ علی محمد خاں چشتی نظامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے سنی بے اختیار اُچھل پڑے اور فرمایا گرامی صاحب غضب کر دیا۔ کیسا عجیب وغریب اور وسیع مضمون آپ نے اپنی رباعی میں ادا کر دیا ہے۔ کچھ بیان تو فرمایئے کہ آپ کا عنقائے خیال کہاں تک پہنچا ہے۔ فرمانے لگے ان اللہ خلق آدم علی صورتہ ۔حضرت نے فرمایا گرامی کیا کہتے ہوتم نے تو رباعی میں ایسا مضمون باندھا ہے جس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ یہ سن کر انہوں نے اپنی آنکھیں پھاڑیں اور حضرت کی طرف غور سے دیکھا اور کہا ہاں ہم تو کہہ دیتے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں۔ سمجھئے سمجھایئے ہم سے بیان نہیں ہوسکتا۔ حضرت علامہ اقبال نے گرامی کی صحیح ترجمانی فرمائی ہے۔ لکھتے ہیں۔

کچھ ضروری نہیں کہ صاحب الہام اپنی بلاغت سے بھی آگاہ ہو۔ اگر گرامی صاحب کے خیال میں وہ معنی نہ تھے (جو میں نے بیان کئے) تو کچھ مضائقہ نہیں اُن کے الفاظ میں تو موجود ہیں"۔ یک قطرہ زخم خانہ رازم دادی یعنی تو نے مجھے اپنے خم خانہ راز سے ایک قطرہ عطا فرمایا اور مجھے اپنے ناز و نیاز کے اسرار پر آگاہی بخشی۔ تیری مہربانی اور لطف و کرم نے مجھے تذلل عبدیت کا

انشراح اور علو ربوبیت کا علم عطا فرمایا۔ بس ذاتی اور صفاتی طور پر میرا تیرے ساتھ کوئی اشتراک نہ رہا۔ تو مجھ سے گناہ کا صدور ناممکن ہوگیا۔ کیونکہ گناہ کی اصل شرک ہے۔ جو مجھ سے شرک ہی مٹ گیا تو گناہ کا امکان آپ ہی ختم ہو گیا اور یہی عبودیت کاملہ ہے۔ اِسی عبوذیت کاملہ کے سبب انبیاء علیہم السلام سے گناہ سرزدنہیں ہو سکتے اور یہ بات بندہ میں اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب بندہ اپنی پوری صفات بندگی کے ساتھ قائم ہو

گرامی صاحب کے کس کس شعر کی تعریف کی جائے۔ اُن کی یہ خصوصیت عطائے وہبی تھی۔ ان کے اشعار کی بلاغت اور دبدبہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بڑے عارف باللہ اور فضلائے روزگار میں سے ہیں۔ اگرچہ یہ بات شواہد سے ثابت نہیں ہوتی تو پھر ہم کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضا میں خیال میں غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یا خود بزبان گرامی

برسخنہائم گرامی جبرائیل آمد بوجد این ہمہ دل گرمیٔ ذوق خداداد من است

ایک رباعی اور ملاحظہ فرمایئے جس میں انہوں نے صوفیاء کی سیرنفس کا بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

برخیز کہ عارفاں بہ خود سیر کنند درپردہ نظر بہ کعبہ و دیر کنند
خود رادید نہ غیر از خودرفتند خود غیر خود اندقطع از غیر کنند

یعنی اے غافل دیکھ ہوشیار ہوتم تجھ کو ایک ایسا روشن اور صاف راستہ بناتے ہیں جس پر چلنے سے سالک کو عرفان نفس حاصل ہوتا ہے جس کا نتیجہ عرفان حق ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ''درپردہ نظر بہ کعبہ و دیر کنند'' یعنی وہ

ہر چیز کی حقیقت پر نظر کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ اچھا ہے کہ وہ کعبہ و دَیر کی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح کہ ''خود را دید ند غیر از خود رفتند'' یعنی وہ اپنے آپ کو غیر دیکھتے ہیں۔ اس غیر کو دیکھنے میں اُن پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے اور اس بے خودی میں ان پر اشیاء کی حقیقت منکشف ہوتی ہے اور بے خود ہو جاتے ہیں جب وہ خود ہی اپنا غیر بن جائے تو پھر غیر سے تعلق ہی کیا رہا۔ یہ اس لئے کہ خودی تعین کے اعتبار سے حقیقت کا غیر ہے اور حقیقت کا حجاب سے حجاب ہے جب تک خودی دفع نہیں ہوگی حقیقت کا انکشاف نہیں ہوسکتا۔ اکبر الہٰ آبادی نے بالکل صحیح فرمایا ہے۔

بے خودی ہی عشق میں مقصود ہے حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

چنانچہ گرامی فرماتے ہیں۔ ''خود غیر خود اند قطع از غیر کنند''۔ پس یہاں یعنی اس حال میں اُس کو لا موجود الا اللہ کا مشاہدہ ہوگا۔ یہ ہیں وہ عارفانہ رموز جن کو گرامی نے چھوٹے چھوٹے چار مصرعوں میں کمال فن کے ساتھ ادا کر دیا ہے اور یہ خوبی کچھ ان کی رباعیات کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے بلکہ ان کی اکثر غزلیات میں بھی شان تصوف جھلکتی ہے۔ یہاں ایک غزل ہم بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ غزل گرامی مرحوم نے غالباً حضرت حافظ علیہ الرحمہ کی غزل پر کہی ہے۔ غزل موجود ہے نظر انصاف سے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ گرامی کی غزل حضرت حافظ علیہ الرحمہ کا فیضان ہے۔ پوری غزل مرصع ہے اور اس کے تمام اشعار معناً ایک دوسرے سے پوری طرح مربوط ہیں۔ گرامی فرماتے ہیں۔

نہاں بہ پردۂ فطرت ہزار بوالعجبی ست تبسم سہنے امتیاز بے سببے ست

یعنی پس پردہ فطرت ہزارہا عجائبات اور نیرنگیاں موجود ہیں۔ ایک سبب

ہی کو لیجئے۔ جس وقت پردہ اُٹھتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ بے سبھی کو امتیاز حاصل ہے ۔ عام طو پر روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ جب اسباب ختم ہو جاتے ہیں، وسائل منقطع ہو جاتے ہیں اور حیلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ تو یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ بلامعاوضہ بخشش و عطا، عنایت ازلی اور فضل ربی کا کرشمہ ہے۔ عارف شیراز خواجہ حافظؒ نے اپنے سبوئے مستانہ سے زندان لااُبالی کو کچھ یہی شراب اس طرح پلائی ہے۔

سبب پرس چرچ ارچہ سفلہ پرور شد کہ کام بخشی اور ایں بہانہ بے سبھی ست

آگے فرماتے ہیں۔

حدیث دل بزبانِ نگاہ می گویم زبان عجمی و نگاہِ ما عربی ست

یعنی میں اسرار دل اورواردات قلبیہ کو زبان نگاہ سے سناتا ہوں۔ بقول اقبال

خموشی گفتگو سے بے زبانی ہے زباں میری

بھیکا بات آگہم کی جو کہن سنن میں ناں جو جانے سو نہ کہے، کہے سو جانے ناں

اور ہر مدعی اپنے دعویٰ میں شہود حق سے محجوب ہے اور جو بولا وہ مارا گیا۔ اسی لئے ہونٹ سینے اور زبان گونگی کرنے کی ہدایات ہیں۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اس بات پر یوں قدغن لگائی ہے۔

باطن میں اُبھر، کر ضبطِ فغاں، بے اپنی نظر دل جوش میں لا، فریاد نہ کر،

اے کار زباں تاثیر دکھا، تقریر نہ کر

گرامی صاحب فرماتے ہیں جب کہ میرا حال یہ ہے تو پھر کیا کہوں

نہ جبریلؑ نہ حسابم ونہ جوہر فردا مرح خواجہؐ بخوانم کمال بے ادبی ست

یعنی نہ میں جبریلؑ ہوں کہ مامور من اللہ ہیں اور نہ مداح رسول صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم حضرت حسان بن ثابت ہوں جن کو جبریلؑ کی تائید و حمایت حاصل تھی اور نہ جوہر یکتا ہوں۔ پھر مدح خواجہؐ میں کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے بلکہ سخت بے ادبی ہے۔ عارف شیراز شیخ سعدیؒ نے تو اپنے منہ کو ہزار بار مشک و گلاب سے دھونے اور پاکیزہ بنانے کے بعد پھر بھی یہی اعتراف کیا ہے کہ آپ کا اسم گرامی زبان سے لینا ہی کمال بے ادبی ہے کیونکہ کماحقہ آپ کی صفت و ثنا ممکن ہی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

یا صاحب الجمالؐ و یاسیّد البشر   من وجهک المنیر لقد نورالقمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہ   بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عبد ناقص اپنی عجمی زبان سے جو کچھ کہے گا ناقص و ناتمام ہوگا۔ اور اس پر آفتاب کو چراغ دکھانے کی مثل صادق آئے گی۔ غالب نے اِسی لئے کہا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم   کاں ذاتِ پاک مرتبہ دان محمدؐ است

غالب نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نعت سے عجز و سکوت اس لئے اختیار کیا ہے کہ نبی اُمیؐ کے کمالات و صفات کا احاطہ ممکن نہیں۔ ان کی منقبت کا حق خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ادا کر سکتی ہے کیونکہ وہی علیم و خبیر خواجہ کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی صفت و ثناء اور علو مرتبت سے واقف ہے کہ عنایت ازلی نے اُن کو کس شان سے نوازا۔

تیرے مقام کا تو خدا ہی کو علم ہے   جنت تو ہے جگہ ترے ادنیٰ غلام کی

ہماری جہت میں عجز و قصور ہی ہے۔ پس شپر نابینا ناقص و خام کا سپہر حسن و خوبی کے مہر نیمروز کے متعلق جو کچھ کہے گا بے ادبی ہی ہوگی۔ اس اعتراف عجز کی حالت میں عنایت ازلی سے۔

سحر بگوش من آمدندا از حضرت قدس　　کہ صدرِ بزم نبوت یتیم مطلبی ست

یعنی پچھلی رات حضرت قدس سے میرے معنی کانوں میں یہ آواز آئی کہ صدرِ ایوان رُسل اور شمع بزم انبیاء بنو مطلب کا ایک یتیم ہے یعنی عنایت ازلی کا لاثانی شاہکار جن کی تعلیم و تربیت اس عالم اسباب میں کسی نے نہیں کی۔ اگرچہ وہ نبی الامی ہیں لیکن بفضل خدا۔

مصطفیٰ ﷺ آمد جنابِ امرِ کُن　　آفتاب برج علم من لدن

جن کو عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہر چیز کا علم ہے اور وہ علم الاولین و الآخرین کے مالک ہیں۔ یہ کمال علم منجملہ مواہب کے ہے اور حد بشر سے باہر ہے کیونکہ اس عطائے ربانی کا تعلق قلب و رُوح سے ہے۔ جس کے مُدرکات انسان کے ظاہری حواس اور عقل کے مدرکات سے بالکل ممتاز و الگ ہیں۔ یہ یتیم مطلبی جو عنایت ازلی کا مظہر اکمل ہیں اپنے آپ کو عبدہ و رسولہ فرماتے ہیں۔ لیکن اُن کے علو مرتبت اور حد کمال کا اندازہ بشری طاقت کے امکان سے باہر ہے۔

چنانچہ حضرت سعدی شیرازیؒ جیسے عارف و رازداں یوں فرماتے ہیں۔

عرش است کمیں پایہ زایوان محمدؐ　　جبریل امیںؑ خادمِ دربان محمدؐ

آں ذاتِ خداوند کہ مخفی ست بعالم　　پیدا و عیان است بچشمان محمدؐ

توریت کہ بر موسیٰؑ و انجیل عیسیٰؑ　　شُد محو بیک نقطہ فرقان محمدؐ

ازبہر شفاعت چہ اولو العزم چہ مرسل　　درحشر زندوست بدامانِ محمدؐ

یک جاں چہ کند سعدیؔ مسکیں کہ دو صدجاں　　سازیم فدائے سگِ دربان محمدؐ

پس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو گرامی کا صدرِ ایوانِ نبوت بنا کر یتیم مطلبی کہنا ثابت و ظاہر کرتا ہے کہ امتیاز بے سببی اور عنایت ازلی کا لاثانی مظہر

اور اکمل و اتم شاہکار صرف آپ ہی کی ذات گرامی ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔

بحکم مرشد شیراز آتشے خواہم که درصراحی چینی وشیشه حلبی ست

12

یعنی مرشد شیراز کے حکم سے آتش عشق کا طالب ہوں۔ یہ کہاں سے ملے گی۔اُن کے دروازہ کا سائل ہوں اور جانتا ہوں کہ کریموں کے دروازہ کا سائل محروم نہیں رہا کرتا۔ مجھے آتش عشق اس لئے درکار ہے کہ ماسوی المحبوب جل کر خاکستر ہو جائے۔ میں شراب عشق اس لئے چاہتا ہوں کہ ''بے خودی ہی عشق میں مقصود ہے'' اورانانیت کے بت کو پاش پاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُس آتش عشق و محبت و معرفت کا طلبگار ہوں جس سے عنایت ازلی نے قلب پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کو مزین فرمایا تھا۔ جس سے علم اولین و آخرین منکشف ہوتے ہیں۔ یہ عقل کے بس کا روگ نہیں۔

کتابِ عقل و رق درورق فروخواندیم تمام حیلہ فروشی ومدعاطلبی ست

یعنی میں نے کتاب عقل وخرد کو لفظاً لفظاً پڑھ ڈالا۔ پوست در پوست ہی پایا۔ مخ ومغز کا نام ونشان تک بھی نہ ملا۔ رندانِ لا اُبالی کا یہ کہنا کتنا صحیح ثابت ہوا کہ حریم ناز تک پہنچنے کا کوئی راستہ عقل وخرد سے ہو کر نہیں گزرتا۔ کیونکہ عقل کا مدرک اور ہے اور قلب کا اور۔جس طرح سماعت و بصارت وغیرہ کے الگ الگ مدرکات ہیں۔قلب و روح کی مدرک عقل سے بالکل علیحدہ ہیں۔عقل سود و زیاں کے پیمانوں سے جزا و سزا کی حقیقت سمجھاتی ہے جس سے دل و دماغ میں بے چینی پیدا ہوتی ہے پس جب دل کا سرور اوررُوح کا سکون عقل وخرد سے حاصل نہیں ہوتا تو پھر فطرتاً انسان مایوس اور نامراد ہو جاتا ہے۔ اس حالت نامرادی میں رحمت خداوندی اس کی دستگیری کرتی ہے جیسا کہ اکمل صوفیاء کرام

نے فرمایا ہے کہ با مراد شد نہ بحالت نامرادی۔ گرامی فرماتے ہیں۔

دلیل عفوِ گنا ہم سبب نمی خواہد　　عنایت ازلی پردہ دا بے سببی ست

یعنی گناہوں کو عفو و بخشش کے لئے سبب کی محتاجی نہیں ہے ۔ عنایت ازلی اور فضل لامتناہی نے مجھ کو اپنی آغوش رحمت میں لے لیا اور کل عالم میں آشکارا کر دیا۔ اس لئے کہ اس کا فضل و کرم کسی علت کا محتاج نہیں ہے۔ رُومی صبوحی سے عنایت ازلی کا سرور بادہ کشانِ محبت کو اس طرح مل رہا ہے۔

بربندہ ناگہانی کہ دی نثار رحمت　　جز لطف بے حد تو آں را سبب نہ دیدم

اور جناب حافظ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

سبب پرس کہ چرخ ارچہ سفلہ پرور شد　　کہ　　کام　　بخشی

فیضانِ لا متناہی اور عنایت ازلی کے شواہد اس کثرت سے ازل سے موجود ہیں کہ جس کو کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ موثر حقیقی صرف وہی ہے۔ گرامی فرماتے ہیں۔ دوست کی نظرِ التفات کا کوئی سبب اور علت نہیں ہے ایک رُباعی میں لکھتے ہیں۔

درصبح الست ورسِ ماحق طلبی ست　　برمانگہ دوست سبب بے سببی ست

برحکم وفا تخت شہنشاہی ما　　فقراست کہ آں فخر رسولؐ عربی ست

نگہ دوست کی بے سبب مہربانی نے درماندگان بادیہ عشق کی لاج رکھ لی۔ ورنہ عقل و خرد کی تہی دستی نے ''لا'' کہہ کر میرے نازک دل جو جس میں حقیقت ایمانیہ منعکس ہے توڑ ڈالا تھا۔

زحرف لا کہ ترابر زباں رود بشکست　　دل مَن است بہ پہلو کہ شیشہ حلبی ست

تیرے انکار پر جو شکستگی مجھ میں پیدا ہوئی ۔ اور تیرے اس لفظِ'' لا''

سے جو بے چارگی اور درماندگی مجھ پر غالب ہوئی اس کا علاج عقل وخرد کے پاس تو تھا نہیں اس کے لئے حضرت خواجہ حافظ کا مشورہ یوں ہے۔

دوائے دردِ خود اکنوں ازاں مفرح جو   کہ در صراحی چینی و شیشہ حلبی ست

یہاں تیرے لطف بے حد اور عنایت بے حد نے مجھے نگاہِ آئینہ ساز میں عزیز تر کردیا۔ یہ اس طرح کہ اس شکستگی میں مجھے تو نے نالہ ہائے نیم شبی عطا فرمائے۔ جس نے میری ظلمت کو نور سے اور میری شب فراق کو روز وصل سے بدل دیا۔

بہ نیم خندہ گرامی شَبم بروز آورد   کرشمۂ اثر نالہ ہائے نیم شبی ست

یہ ہے نالہ ہائے نیم شبی کا کرشمہ، یہ ہے بے سبب رحمت، یہ ہے تیری
ست   سببی   اور ابہانہ   بے
عنایت ازلی جو ہمیشہ رہی ہے پردہ دار بے طلبی۔

''راہ فردا'' کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ پہلے طبع شدہ تمام نسخے تقسیم ہو جانے کے بعد احباب و شائقین کے اصرار پر حضرت سیّدی و مولائی کی اجازت سے حضور کے دیرینہ غلام الحاج میاں محمد اصغر رئیس اعظم بہاول نگر نے اس ایڈیشن کی طباعت و اشاعت کا انتظام اپنے خرچ پر کیا ہے۔ اللہ کریم اُن کی یہ سعی مشکور فرما کر اسے باعث مقبولیت بنائے اور اجر جزیل دے۔ موجودہ ایڈیشن میں جناب گرامی کا لکھا ہوا مقدمہ بھی جو پہلے ایڈیشن میں چھپا تھا، شامل کر دیا گیا ہے۔

خاک پائے درویشاں

دُعا جو مسلم نظامی اُردو منزل ۔ پاکپتن شریف ضلع ساہیوال 11 ذیعقد 1391 ہجری بمطابق 30 دسمبر 1971ء۔ اب الحمد للہ چوتھی مرتبہ اُردو ترجمہ کے ساتھ راقم الحروف (سائیں نذیر حسین فریدی) کی نگرانی میں فخر جہاں اکادمی گیمبر کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔

☆☆☆☆

شرفِ نظر

شاعری نام ہے یکسر جذباتِ دل کی ترجمانی کا اور تصوف کا سرمایہ ''عشق حقیقی'' جو از سر تاپا جذب ہے اور جوش، پس تعریف اُس دل کی کیجئے جو شورش اُلفت کا حامل ہو اور ثنا کیجئے اُس شاعری کی جو ایسے جذبات کا آئینہ بنے۔ شاعری مختلف قسم کے اصناف خواہش کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مگر اُن سب میں قابل ذکر وہی صنفِ شعر ہے جس میں انسانی سینہ و قلب کے لئے ایمان و ایقان کی حرارت مہیا کی گئی ہو اور رُوحانی و جدانی کے ارتقاء کا اہتمام کیا گیا ہو۔ دُنیائے علم و ادب میں ایسے اعجاز کا ظہور بارہا ہو چکا ہے جب کہ کسی صاحب ورد کا سکوت تکلم، بیخودی کے ہاتھوں شکست یاب ہو گیا اور دل کی شورشوں نے الفاظ کا پیکر اختیار کر لیا ہواور مضمون کے علو کی فلک پیمائیوں نے خاک نشینوں کے لئے بیان کی لذت اور رُوح کے لئے رمز کی مسرت کی اک طرح نہ ڈال دی ہو۔

جلیل المرتبت حضرت گرامی، منقبت سرائے قطب الاقطب سلطان الہند خواجہ معین الدین حسن سنجری قدس سرہ العزیز، کسی تعارف کے محتاج نہیں اُن کے تخیل و شعر کے میکدے میں ایسے بادہَ مردافگن کی کمی نہیں تھی تاہم شرف خیال اور فکر کا ہے جو منقبت خواجہ بزرگ اجمیری میں تکلم کے پیمانہ سے چھلکا۔

اَے زہے فکر فلک بوس!

منقبت میں تخیل کی نزاکت ، جذبہ کی سربلندی، عشق کی شورش نازِ ارادت و وابستگی کا عجز جس جس اسلوب سے بیان ہوا ہے اُس نے ہر شعر کو اک

طلسم معنی و بصیرت کے علاوہ درس باطن عطا کر دیئے ہیں۔ جن میں سے ہر باطن تصوف کے نازک ترین مسائل سے باہم دگر ہے۔ منقبت کا عرفان شعری موقوف تھا اِک شرحِ بلیغ پر جس کو قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین حضرت میاں علی محمدؒ شاہ صاحب سجادہ نشین درگاہ فلک پائگاہ حضرت قبلہ عالم میاں محمدؒ شاہ صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہوشیار پوری نے علی وجہ الاتم پورا کر دیا۔

فلسفیوں کے نزدیک اشیاء عالم کا ادراک ظاہری حواس سے ہوتا ہے وہ کہتے ہیں جو اس کے مدرکات دماغ میں پہنچتے ہیں۔ پھر اُن پر دماغ مختلف صورتوں سے رد و قدح کرتا ہے۔ جزئیات سے کلیات بناتا ہے۔ تحلیل و ترکیب سے کام لیتا ہے، مقدمات بناتا ہے اُن سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ الغرض اُن کا تمام علم و ادراک جو کچھ ہے وہ صرف حواس کے مجموعہ عمل کا نام ہے۔ لیکن اس کے برعکس ارباب تصوف کے ہاں ان سب کے علاوہ ایک اور ''حاسہ باطنی'' ہے جو'' مشق اور ریاضت'' ہے اور اِس ''حاسہ باطنی'' سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اُس کے تصوف کی دُنیا میں مختلف نام ہیں۔ کشف، مشاہدہ، اسی عرفان کے بعض عرف ہیں۔ فلسفی جو کچھ کہتے ہیں قیاس اور استدلال کے بل بوتے پر اور صوفی جو کچھ کہتے ہیں مشاہدہ کی نعمت و فضیلت سے، فلسفی کہتے ہیں، جانتے نہیں، صوفی جانتے ہیں، کہتے نہیں۔ پس فرق مراتب ظاہر ہے۔ شیخ بو علی سینا ایک مرتبہ سلطان ابو سعید ابو الخیرؒ سے ملے اور اپنی فلسفیانہ تحقیقات ظاہر کیں۔ سلطان نے گوش گذار کر لیں۔ اور جب شیخ چلے گئے تو سلطان نے فرمایا'' آنچہ اُومی داند، می بینم''۔ یہ کیا چیز تھی، وہی حاسہ باطنی''۔

حضرت میاں صاحب ممدوح نے واردات گرامی پر جس نوع کا حاشیہ

لکھا ہے اور جس ملکہ عرفانی سے مقاماتِ تصوف پر گفتگو فرمائی ہے وہ وہی حاسہ باطنی ہے جس کا ملکہ ان حضرات کا معمول بہ ہے۔ قبولیت منقبت کے دو پہلو ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔ اولاً یہ کہ جب منقبت حضرت خواجہ بزرگ غریب نواز میں پیش کی گئی تو دیگر قصائد نگار شعراء ہند کے ناموں کی ساتھ گرامی اور سب کے نام لکھ لکھ کر اک ظرفِ گلی میں ڈال کر حضرت خواجہ بزرگؒ کے مزار کے اندر رکھ دیئے گئے اور صبح کو ایک نہایت صغیر سن بچے سے ''پرچیاں'' نکلوائی گئیں تو تین مرتبہ گرامی، گرامی برآمد ہوا، اے زہے شرفِ قبول!

ثانیاً شرف منقبت کے لئے یہ فخر بھی بس ہے کہ حضرت میاں صاحب ممدوح نے اپنے متصوفانہ خیالات سے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ اور اگر شرح نویس کی خدمت کو بھی کسی کا ایما قبول کر لیا جائے تو یقیناً منقبت غیر فانی ہو گئی۔ بہرحال رہردان منازل سلوک حضرت میاں صاحب کے حاشیہ میں بہت سے نکتے اور اس راستے کے لئے معین راہ پائیں گے اور ہم تو نہایت مسرور ہیں کہ اِس حیلے سے حضرت ممدوح کے افادات علم و عرفان سے فیض یاب ہو سکے۔ قربان جایئے اس اتفاق کے، مجھے باوصف اپنے اعتراف عجز کے اس سعادت کے حصول پر ناز بھی ہے کہ منقبت نگار گرامی اور مرتب تحشیہ حضرت میاں صاحب قبلہ کے ساتھ یہ چند سطور لکھ کر عزت قرب اور اختصاص دوام حاصل کر رہا ہوں۔ خدا کرے یہ شرف معیت اور نسبت کی خصوصیت دربار چشت میں میری نیاز مندی کے رسوخ کی ضمانت ہو جائے۔ آمین

گدائے کوئے چشت: خلیقی دہلوی

☆☆☆

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

تقریظ

از قلم علامہ قاسم الرضوی صاحب ایم اے

ہر دور میں صدق و صفا کے علمبردار بھٹکی ہوئی دُکھی انسانیت کو راہ حق پر لگانے کیلئے دُنیا میں تشریف لائے۔ ان میں سرفہرست انبیاء کرام اور مرسلین کی مقدس جماعت ملت کی رہنمائی کیلئے جلوہ گر ہوئی۔ جن کی پیش کردہ مقدس تعلیمات سے لوگ وادی ظلمات سے نکل کر اسلام و ایمان کے اجالے میں آتے رہے۔ بالآخر حضور خاتم النبین رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنے سر پر ختم نبوت کا تاج سجائے کائنات عالم میں تشریف لائے۔آپ نے جو اسوۂ حسنہ ہمارے لئے چھوڑا اور آفتاب رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مستفیض ہو کر صحابہ کرام کی جو مقدس جماعت تیار کی تھی وہ نجوم ہدایت بن کر پوری دُنیا پر چھا گئی۔لوگ راہِ حق پر آتے رہے او رچراغ سے چراغ جلتا رہا۔ صحابہ کرام کے بعد ان کے مشن کی تکمیل کیلئے اس مشن کو اولیاء کرام، صوفیائے عظام نے سنبھالا اور وہ جہاں بھی گئے اور جہاں بھی رہے اپنے مشن کی تکمیل کیلئے دن رات ایک کر دیا اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

انہی اولیاء کرام میں دور حاضر کی ایک عظیم ہستی قطب الوقت فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خان چشتی نظامی فخری علیہ الرحمہ کی بھی ہے۔ جن کی علمی و روحانی کاوشوں سے ضیائے فرید العصر حضرت علامہ الحاج پیر ابوالنصر منظور احمد شاہ چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بانی جامعہ فریدیہ ساہیوال جیسی نابغہ رُوز

گار ہستیاں جلوہ گر ہوئیں جو ظاہر و باطن جاہ و جمال کے لحاظ سے تاریک دلوں کو منور کر رہی ہیں۔ حضرت فرید العصر خواجہ میاں علی محمد خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عہد حاضر کی وہ عظیم المرتبت ہستی ہیں جو نہ صرف زبردست عالم دین تھے بلکہ راہِ فقر کے عظیم سالک بھی تھے جنہیں دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ زہد و تقویٰ ، پارسا شخصیت کے مالک تھے اکثر اوراد و وظائف میں محو رہتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے قلم مبارک کے ذریعے ایسے علمی جواہر تقسیم کیے جس کی مثال نہیں ملتی ۔ ان میں تین علمی رسائل یادگار چھوڑے ہیں جن سے آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ''راہ فردا'' فارسی تفسیر نون والقلم المعروف ، میلاد نامہ'' اور تیسرا رسالہ مکتوب در مسئلہ وحدت الوجود' آپ کی علمی یادگاریں ہیں۔ میلاد نامہ سورہ نوٓن والقلم فی فضائل سیّد العرب والعجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم'' کی ایمان افروز اور عارفانہ و عالمانہ تفسیر ہے۔ جسے سب سے پہلے امرتسر (انڈیا) سے حکیم غلام قادر مرحوم ولد حکیم فقیر محمد امرتسری نے طبع کرایا۔ دوسری بار پاکپتن شریف سے حضور فرید العصر میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شائع کرایا تھا۔ تیسری مرتبہ یہ سعادت حضرت میاں محمود احمد خاں مدظلہٗ نے مدرسہ علویہ بلال گنج لاہور کی طرف سے محترم مولانا سائیں نذیر حسین فریدی کے حصہ میں آئی۔ چوتھی پانچویں اور چھٹی مرتبہ مکتبہ چشتیہ فریدیہ گیمبر اوکاڑا چھاؤنی کے زیر اہتمام اس کی طباعت فنا فی الفرید محترم مولانا سائیں نذیر حسین فریدی کے حصہ میں آئی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ سائیں صاحب کو اپنے پیر خانہ اور دادا پیر خانہ کے آستانے کے ساتھ کس قدر والہانہ عشق و محبت ہے ورنہ یہ کام تو جامعہ فریدیہ ساہیوال اور دیگر فرید العصر حضور میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پروانے بھی کر سکتے تھے مگر یہ سعادت برادرم مولانا سائیں نذیر حسین فریدی کو حاصل ہوئی ہے۔ اللہ کریم اسے شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین ثم آمین

اس کے بعد ''راہِ فردا'' جو حضور فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی فارسی تصنیف ہے۔ دراصل ''راہِ فردا'' حضرت مولانا شیخ غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی وہ منقبت جو انہوں نے حضور خواجہ خواجگان حضرت خواجہ سیّد معین الدین حسن چشتی اجمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی مدح میں رقم فرمائی تھی۔ اس کی شرح فارسی نثر ''راہِ فردا'' کے نام سے حضور میاں صاحب نے اُردُو شرح مولانا غلام قادر گرامی نے اپنے اُردُو مقدمہ کے ساتھ امرتسر سے شائع کر کے منظر عام پر لانے کا تہیہ کیا۔ چونکہ ''راہِ فردا'' فارسی میں ہے وقت گزرتا گیا۔ آخر سائیں نذیر حسین فریدی نے اسے شائع کر کے منظر عام لانے کیلئے اُردُو ترجمہ کے لئے جامعہ فریدیہ ساہیوال کے دیرینہ اُستاد محترم حضرت مولانا ابوالبرکات محمد اللہ دتہ نظامی فریدی کی خدمات حاصل کیں تو انہوں نے ''راہ فردا'' کو اُردُو کے قالب میں ڈھال کر عوام الناس کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ روحانی کتاب ''راہِ فردا'' جانشین حضرت فریدالعصر حضرت صاحبزادہ الحاج میاں محمود احمد خان چشتی نظامی حضرت صاحبزادہ الحاج پروفیسر میاں مسعود احمد خاں و صاحبزادہ الحاج میاں تنویر احمد خان اور حضرت صاحبزادہ داؤد احمد خان صاحبان کی خصوصی شفقت کی مساعی جلیلہ سے شائع ہو رہی ہے۔

''راہِ فردا'' کا ایک ایک جملہ قارئین کرام کے دلوں کو فیضیاب کرتا ہوا نظر آتا ہے اس میں حضور فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی

فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روحانیت کے علاوہ آپ کی قلمی تو انائیوں کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ کس طرح انہوں نے اوراد و وظائف میں مصروفیت کے باوجود عوام اور مریدین عقیدت مندوں کیلئے اپنا علمی شاہکار چھوڑا ہے۔ یقین جانیئے کہ ''راہِ فردا'' پڑھنے والا جب عشق کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بھی فراموش کردیتا ہے اور اپنے دل میں ایک ایسی کیفیت محسوس کرتا ہے جو کہ ناقابل بیان ہے۔حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تیسرا رسالہ'' مکتوب درمسئلہ وحدت الوجود'' جس میں آپ نے حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کے مسلک توحید وجودی اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نظریہ شہود پر بحث فرمائی ہے اورجید علماء کرام و مشائخ عظام دور حاضر کے علماء و مشائخ کے اعتراضات کے جوابات کی صورت میں خطوط تحریر فرمائے ہیں۔ اس سے بھی آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ممکن ہے کہ اس کی اشاعت بھی برادرم مولانا سائیں نذیر حسین فریدی کے حصہ میں آئے کہ انہیں اپنے مرشد خانہ سلسلہ چشتی نظامی فخری کے ساتھ جنون کی حد تک عشق ہے حالانکہ وہ کافی عرصہ سے بیمار ہیں۔ پھر بھی ان سے جب گفتگو ہوتی ہے تو اس سلسلہ کے ساتھ والہانہ لگاؤ کی گفتگو کرتے ہیں۔ گویا طلب بھی انہی کی ہے اور تڑپ بھی انہی کی۔۔۔جستجو بھی انہی کی ہے اور گفتگو بھی انہی کی۔

اللہ کریم انہیں صحت یابی کے ساتھ خضری عمر عطا کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ تصنیف و تالیف علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہیں۔

دُعاگو! قاسم رضوی ایم اے چیچہ وطنی

۞۞۞☆☆☆۞۞۞

عرضِ ناشر

یوں تو تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلام کا ہر ایوان اولیاء کاملین کے روحانی، عرفانی اور وجدانی کمالات کا آئینہ دار ہے۔ تاہم تجدید احیائے اسلام کے علاوہ جو داستانیں اولیاء کرام نے رقم کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں عہد حاضر کی ایک عظیم علمی و روحانی نورانی شخصیت قطب الوقت فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خان چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آف پیر صاحب بسی شریف کی بھی ہے۔ جنہوں نے روحانیت اور علم و عرفاں کا نور ایسا پھیلایا ہے کہ جن کے دم قدم سے بانی جامعہ فریدیہ ساہیوال ضیائے فرید العصر حضرت علامہ مولانا الحاج پیرابوالنصر منظور احمد شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسی نابغۂ روز گار شخصیات نے شمع علم عرفان بن کر ملک کی پورے ماحول کو روشن کردیا اور ان شاء اللہ یہ روشنی پوری دنیا میں پھیل جائے گی اور ظلماتِ جہالت دور کرے گی۔ ہمیں یہاں الحاج قطب الوقت فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خان چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حیات مبارکہ بیان نہیں کرنا بلکہ ان کے مرید با صفا حضرت مولانا الحاج ابوالنصر منظور احمد شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لئے ان کے جامع مگر مختصر کلمات جو ان کی پوری زندگی پر احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ علم کے سمندر تصوف و معرفت کے بحر زخار تھے۔ اس صدی میں اگر علم کسی شکل میں آتا تو یقیناً وہ حضور میاں صاحب کی شکل میں آتا۔ تصوف و معرفت اگر مجسم ہوتے تو وہ شیخ العالم کے رنگ میں ہوتے علم کسی بھی شکل میں ہوتا تو وہ شیخ الاولیاء کے جسم کا انتخاب کرتا۔ اخلاص و اخلاق کوئی

وجود اختیار کرتے تو وہ وجود حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہی ہوتا۔ آپ نے اپنی مقدس حیات میں شریعت وطریقت دونوں کی آب یاری فرمائی"۔ مجیب الرحمٰن شامی چیف ایڈیٹر روزنامہ پاکستان کتاب گلہائے عقیدت صفحہ 119 پر لکھتے ہیں۔" چاند سی صورت کا محاورہ پڑھا بھی اور دیکھا بھی لیکن سچ پوچھیئے اس پر حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پورے اُترتے تھے بہت کم لوگ اترتے ہوں گے۔ صورت اور لباس، صفائی اور پاکیزگی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ایک بار ان کی طرف دیکھیں تو دوسری بار دیکھنے کیلئے دل مچل مچل جاتا تھا۔ اگر یہ درست ہے کہ چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے تو پھر میاں صاحب قبلہ ایسے صاحب دل تھے جو اس دور میں انگلیوں پر گنے جا سکیں۔ حضرت مولانا عبدالسلام نیازی دہلوی جن کا نام اہل علم کے لئے خوب جانا پہنچانا تھا دہلی کی معروف شخصیت تھے۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دربار شریف پر حاضر تھے۔ وہ بھی حضور میاں صاحب کو دیکھ کر سراپائے نیاز بن گئے۔ حضور میاں صاحب کی اجازت سے عرض کی حضرت میرے دل کی آواز ہے کہ جب جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے ہوں گے تو وہ آپ کی شکل میں آتے ہوں گے۔ شامی صاحب لکھتے ہیں حضور میاں صاحب ایسے پیر تھے کہ پیرانہ عادات ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھیں۔ لالچ نہ حرص، تصنع نہ بناوٹ طمع و نہ شوخی۔ بس سنجیدگی کی ایک لہر تھی جو سر سے لے کر پاؤں تک حکمران تھی۔ نہ زیادہ بولتے اور نہ زیادہ سنتے ہر دم ہاتھ میں تسبیح اور زبان پر خدا کا نام رہتا"۔ ﴿گلہائے عقیدت 119﴾

اس وقت ہم فریدالعصر حضرت الحاج خواجہ میاں علی محمد خان چشتی نظامی

فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آف پیر صاحب بسی شریف کی علمی ادبی خدمات کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔ زیرِ نظر تصنیف ''راہِ فردا'' ان کی عملی و علمی تصویر ہے۔ آپ نے اوراد و وظائف کی مشغولیت ہونے اور اہل محبت سے ملاقاتوں کے باوجود تین عظیم علمی رسائل تصنیف فرمائے۔ میلاد نامہ، مکتوب در مسئلہ وحدت الوجود۔ تحریر کر کے اہل دل کی محبت کو جلا بخشی۔ اس سے قبل (راقم الحروف) میلاد نامہ مکتبہ چشتیہ فریدیہ ۔فخر جہاں اکادمی گیمبر کے زیر اہتمام چار مرتبہ شائع کر چکا ہے ۔ جس کی علمی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی ہے اب آپ کی زیرِنظر تصنیف ﴿راہِ فردا﴾ جو کہ فارسی زبان میں تھی اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ جسے عوام الناس تک پہنچانے کے لئے حضرت علامہ ابوالبرکات محمد اللہ دتہ فریدی نظامی نے اُردُو میں جامہ پہنایا ہے۔ جس کا مطالعہ یقیناً راہِ حق کے متلاشی حضرات کو منزل پر پہنچائے گا۔ ''راہِ فردا'' کا ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جائے گا تو روح پر نورانی و وجدانی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ ''راہ فردا'' دراصل حضرت مولانا غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی وہ منقبت ہے جو انہوں نے حضور خواجہ خواجگان خواجہ غریب نواز معین الدین اجمیری چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ شہنشاہ اجمیر کی مدح میں رقم فرمائی اور اس کی شرح مبارک فارسی نثر ''راہِ فردا'' کی صورت میں فرید العصر حضرت خواجہ میاں علی محمد خاں چشتی نظامی فخری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمائی اور یہ شرح حضرت مولانا غلام قادر گرامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اُردُو میں مقدمہ کے ساتھ دہلی سے چھپوائی تھی۔ اب یہ سعادت راقم الحروف (سائیں نذیر حسین فریدی) کو حاصل ہو رہی ہے۔ جو یقیناً ہر ایک کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ اس کا ایک ایک حرف مدتوں قاری کو ''راہِ فردا'' دکھائے گا۔ جس

پر چل کر انسان منزل مقصود پر پہنچ کر اپنی دُنیا و آخرت سنوار سکے گا۔

ان شاء اللہ ''راہِ فردا'' کی تشریح سے یہ بات بھی واضح ہو گی کہ حضور میاں قبلہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ واقعی علم وعمل کا ایک بحر ذخار تھے۔ اور راہِ فقر کے سالک بھی آپ نے اپنے مبارک قلم سے ایسے ایسے نکات بیان فرمائے ہیں جس سے نہ صرف آپ کے تبحر علمی کا اندازہ ہوگا۔ بلکہ خانقاہی نظام کے ساتھ فقہ و تصوف کے ایسے ایسے نکات بیان فرمائے ہیں جن سے قاری کو کونین کے علمی و ادبی خزانے جمع کرنے کی سعادت ہی حاصل ہوگی جو اس کے لئے آخرت کی کامیابی کا باعث بنے گی۔ ''راہِ فردا'' ہر اہل محبت کے لئے مشعل راہ ثابت فرمائے اور حضور قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے طفیل خواجگان چشت اہل بہشت کی توجہ مبذول فرمائے۔ آمین بجاہِ سیّد المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

آخر میں ابوالبرکات اللہ دتہ فریدی نظامی، مولانا قاسم رضوی ایم اے، صاحبزادہ پیر اظہر فرید شاہ ، حاجی احسان الحق فریدی، علامہ ندیم طیب فریدی، صاحبزادہ حافظ طیب فرید اور میاں افتخار احمد سکھیرا کا مشکور ہوں جن کے قلمی تعاون سے زیر نظر کتاب راہِ فردا منصۂ شہود پر آئی اس کے لئے حضرت صاحبزادہ میاں محمود احمد خاں ، صاحبزادہ مسعود احمد خاں دامت برکاتہم العالیہ کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مالی سرپرستی فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی خدمات کوشرف قبولیت عطا فرمائے۔ صحت وتندرسی کے ساتھ خضری عمر عطا فرمائے آمین

خاک راہِ درد منداں

سائیں نذیر حسین فریدی 22-02-22

فرید منزل اسلام پورہ گیمبر اڈا ضلع ساہیوال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا شعر:۔

☆راہِ فردا میزند امروزمَن اے وائے مَن
غوطہ در گرداب امروزم خود، فردائے من

مفہوم:

ہائے افسوس کہ میرے امروز (شغلہائے حیات دنیا) نے میرے فردا (حیات اخرویہ کی تیاری) کا راستہ مار دیا ہے۔ بایں وجہ میرا فکرِ آخرت، میرے دنیوی اندیشوں، وسوسوں کے بھنور میں کھو گیا ہے۔
(حضرت شارح علیہ الرحمہ شعر متذکرہ بالا کو دو طرح سے بیان فرمایا ہے)

تشریح اوّل:

بحکم حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم "اَلدُّنۡیَا مَزۡرَعَۃُ الۡاٰخِرَۃُ " دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ حیاتِ دنیا، حیاتِ اُخرویہ، حقیقیہ، ابدیہ کی بنیاد ہے۔ اُخروی حیات حقیقیہ کا حسن و جمال، حیات دنیا کے سنورنے میں موجود ہے۔ مگر حد درجہ افسوس اور شرمندگی ہے کہ میری زندگی اپنے مذموم احوال کی وجہ سے میری آخرت کی فلاح اور کامیابی کے سراسر منافی ہو گئی ہے۔

تنبیہ:

(صاحب دانش پر واضح ہونا چاہئے) کہ اس شعر میں امروز سے دنیا اور فردا سے آخرت مراد لینا، علم معانی کے قانون ظرف بول کر

مظروف مراد لینے کے مترادف ہے۔ تاکہ مقصودِ شاعر (دنیوی زندگی کی بدعملی، حیات، حقیقی، اُخروی کی بربادی کی وجہ ہے) خوب ظاہر ہو۔

قضاء و قدر کی لطیف وضاحت:

قضا کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ اکبر علیہ الرحمہ نے فصِ قدریہ میں بیان کیا ہے۔ ''دراصل قضاء مخلوق یعنی اشیاء پر اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جو اس کے علم ازلی کے مطابق ہے اور اس کا علم ازلی اشیاء (مخلوق) کے بارے میں اسی طرح ہے جس طرح تمام مخلوق (اشیاء) اپنے اپنے ظاہری وجود کے ساتھ بالذات موجود ہیں''۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ کا حکم مخلوق پر مسلط نہیں کیا گیا جس سے انہیں مجبور کیا گیا ہو کہ وہ ویسی ہی ہوں جیسے اب وہ دکھائی دیتی ہیں۔ بلکہ اس کا یہ حکم قضا اشیاء (مخلوق) کے ایسے ہے کہ یہ ویسی ہوگی جیسی اس کے علم ازل میں موجود تھیں۔

مثال:

(اس لطیف نکتہ کو ایک مثال سے سمجھئے) مثلاً یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ حاکم کا فیصلہ ہمیشہ مقدمہ کی روئیداد کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں۔ ورنہ اسے ظالم ٹھہرایا جائیگا۔ اور خود حق تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ وَمَا اَنَا لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِہ میں اپنے بندوں سے ظلم کا ارادہ نہیں فرماتا۔ بلکہ اُن پر میری قضاء یعنی ان کے اُس کفر و عصیان کے مطابق ہے جو میرے علم ازل میں تھا۔

بس اللہ تعالیٰ کا یہی حکم کلی جو کہ ایک خاص وقت میں (بمطابق علم الہٰی) متعین ہوا اور پھر اپنے وقت مقررہ پر (بمطابق علم الہٰی) خارج میں ظہور پذیر ہوا ''تقدیر'' کہلایا ہے۔ 20

چنانچہ حدیث شریف میں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایک ایسی دیوار کے قریب سے تیزی سے گزرے جو گرنے کے قریب تھی۔ آپ سے پوچھا گیا أَهَرِبْتَ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ کیا آپ اللہ کے فیصلے سے بھاگتے ہیں؟ فَقَالُو نَعَمْ! اَنَا هَرِبْتُ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ اِلٰی قَدرِہٖ۔ فرمایا ہاں لیکن میں اللہ کے فیصلے سے اس کی تقدیر کی طرف بھاگا ہوں۔

یعنی میں اس کا وہی حکم کلی بجا لا رہا ہوں جو (اس کے علم ازل میں) میرے بارے میں متعین و مقدر ہو چکا تھا۔

پس واضح ہوا کہ اس کا حکم (قضاء) عین اس کی تقدیر بھی ہے اور حق تعالیٰ کا یہی حکم کلی حقیقتاً (قضائے الہٰی یعنی تقدیر) کی حقیقتِ مستورہ ہے۔

قضاء قدر کی اس بحث سے یہ مزید واضح ہوا کہ حکم الہٰی ہمیشہ علم الہٰی کے مطابق ہوتا ہے اور علم الہٰی، معلومات الٰہیہ کے تابع ہوتا ہے۔ ثابت ہوا کہ اشیاء معلومہ کے متعلق ازل میں جو کچھ علم الہٰی میں متعین ہوا بقضائے ازل وہ ہی کچھ اعیان ثابتہ (وجود دنیا) عین ظاہر ہے۔ ایسا نہیں کہ اشیاء معلومہ کو اللہ تعالیٰ کے علم ازلی کے مطابق متعین کیا گیا اور اس کی تقدیر خفی کو اس کی قضا کے مطابق ان پر مسلط کر کے

پھر اس کے تمام فیصلے اس کی تقدیر خفی کے مطابق جاری کئے گئے ہوں۔اس طرح قضاء و قدر کے معاملے میں انسانوں پر حجت الٰہیہ مکمل طور پر پوری ہو چکی ہے۔

ایک اشکال اور اس کا حل:

فصوص الحکم کے شارحِ اجل مولانا نور الدین، عبدالرحمٰن جامیؔ قدس سرہٗ العزیز نے اسی نص قدریہ کی شرح فرمایا ہے۔

الف:۔

''اگر کہا جائے کہ اعیان ثابتہ ان کی استعداد کی تمام صلاحیتیں باعتبار استعداد ذاتی، مصنوعات الٰہیہ ہی تو ہیں (لہٰذا ان سے جو کچھ سرزد ہوگا، اللہ ہی کی جانب سے ہوگا) تو ان پر حجتِ الٰہیہ کیونکر پوری ہوئی''۔

تو اس کا جواب یوں ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام اعیان ثابتہ (مخلوق) بمعہ اپنی استعداد و صلاحیت کے حق تعالیٰ کی ہی بتائی ہوئی ہیں اور اس کی تجلیات کے نور سے ہیں لیکن ایسے نہیں کہ حق تعالیٰ نے بطور وجوب ان کے ارادۂ اختیار میں کوئی دخل دیا ہو (اور وہ اپنے ارادہٗ و اختیار کے خلاف ویسا کرنے پر مجبور ہوں) اور پھر یقین کر لیا جائے انہیں حق تعالیٰ نے ایسا ہی بنا دیا تھا۔

ب:۔

''اور اگر یہ کہا جائے جب تمام اشیاء اپنے وجود ظاہری کے اعتبار سے حق تعالیٰ کی تجلیات ذاتیہ سے مُنصہ شہود میں آئی ہیں لہٰذا ان

میں مختلف صورتوں یعنی اُچھائی یا برائی میں ظاہر ہونا اسی کی تجلیات ذاتیہ کے تحت ہے اور برحق ہے تو پھر ان پر جزا و سزا کا مرتب ہونا کیونکر درست ہوا؟''

تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ہمارے اعیانِ ثابتہ سے وقوع پذیر ہمارے اعمال یہ ان کے تقاضوں کے مطابق وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ایسے نہیں جزا و سزا کا مرتب ہونا ہمارے اعیان ثابتہ کے اقتضاء کے مطابق ہے۔

بلکہ جب ہمارے اعیان ثابتہ جب کوئی چیز اپنے اقتضاء اور اپنی استعداد کے تحت حق تعالیٰ علب کرتے ہیں تو وہ مطلقاً ہمیں اپنے جود و کرم سے عطا دیتا ہے۔ حاصل یہ کہ ہمارا خارجی اور ظاہری وجود اسی کے احوال ذاتی کی مختلف شکلیں ہیں۔ مثلاً آئینہ میں تصویر صاحب صورت کا عین عکس ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارا وجود بھی اسی کا عین ہے حق تعالیٰ کے علاوہ جسے ہم وجود تصور کر بیٹھے ہیں یہ محض وہم و گمان اور امر معدوم ہے۔ سراسر بے حقیقت ہے اسی لئے اس میں کھو جانا بے حد مذموم اور یہی ہماری آخرت کی خرابی کا موجب ہے۔

شعر کی تعبیر ثانی:

مجھے افسوس ہے کہ امروز من یعنی میری زندگانی اپنے اندر مستقل قرار نہ رکھنے کی وجہ سے میرے فردا یعنی آخرت میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مطلب یہ کہ میری دنیوی زندگی، اپنے عدم و فنائیت کے

سبب یہ ظاہر کرتی ہے کہ میرا ''فردا'' یعنی اُخروی زندگی بھی بہت ہی خراب و خستہ اور غیر مستقل ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے چونکہ ''امروز و فردا'' دونوں ہی زمانہ کے اجزاء ہیں اور زمانہ، متواتر و مسلسل گھڑیوں اور لمحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس کے لمحات میں اتصال کا ایک ایسا سلسلہ جو انقطاع و انفصال کو قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا اس وصف تجدد و فنائیت کے سبب زمانہ ہر حال غیر مستقل اور فنا پذیر بھی ہے۔ کیونکہ یہی عدم استقلال اس کا وصف ذاتی ہے۔ سو امروز من اور فردائے من اس وصفِ ذاتی میں شراکت کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں بایں وجہ میرے امروز یعنی دنیوی زندگی کی خستہ حالی میرے فردا یعنی اُخروی زندگی کی زبوں حالی کو مستلزم ہے اور یہی میرے لئے حسرت اور تأسف کا باعث ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے چونکہ زمانہ عالم دنیا کے جمیع احوال و احکام میں اصلاً موجود رہتا ہے جسے کسی بھی صورت اجزائے عالم سے مرتفع نہیں کیا جا سکا ہے۔ بلکہ زمانہ اور عالم دنیا کے احکام باہم اس طرح مربوط اور ایک دوسرے میں یوں داخل ہیں کہ ان میں سے ارتفاع زمانہ کا فرض کرنا بھی امر محال ہے۔ اور ان کو الگ الگ کرنا کسی ایسی چیز کو تقسیم کرنا ہے جو سرے سے تقسیم کو قبول ہی نہیں کرتی۔

مزید یہ کہ ارتفاع زمانہ سے تقدم و تأخر، اوّل و آخر کا سارا نظام ہی ختم ہو جائے گا اور یہ غیر ممکن ہے۔

نتیجتاً یہ ظاہر ہوا کہ زمانہ اپنے وصفِ ذاتی یعنی تجدد و فنائیت کی وجہ سے ایسا غیر مستقل ہے جسے کبھی قرار نہیں۔ اس عدم قرار کے باعث میرے امروز (زندگانی دنیا) کا انتفاء میرے فردا (اُخروی زندگی) کے لئے لازمی اور منفرد ہے۔

کما قال اللہ تعالیٰ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِى اللَّيْلِ کہ تو ہی دن میں رات کو اور رات میں دن کو داخل فرماتا ہے۔اس آیت سے ظاہر ہے کہ دن اور رات میں انفصال نہیں تو اس باہمی ارتباط کی وجہ جب فردا نے مقام امروز میں ظہور پایا اور امروز کے بھنور اور ہلاکت گاہوں میں مستغرق ہو کر بسر ہوئی تو میرے آج کی طرح میرا کل بھی برباد ہوا یہی میرے لئے باعث قلق اور وجہ ندامت ہے۔

فلسفہ فنائیت:

شعر مذکور میں گرامی نے بہت لطیف انداز میں ''بحث'' فرمائی ہے۔'' امروز من و فردائے من'' سے ہی اپنی فنائیت مراد لی۔ یعنی اس کا کہنا یہ ہے کہ میرے اپنے وجود (امروز من) کا ثبات ہی خود میری فنائیت ذات کی دلیل ہے۔ مطلب یہ کہ اپنے وجود ظاہری سے وجودِ حقیقی ہونے کی تھی، درحقیقت اپنی فناء کی تحقیق کا ثبوت ہے۔

دلیل:

دلیل اس کی یہ ہے ''ثبوت و فنا'' دونوں باہم متناقص امور ہیں۔ لہٰذا میرا وجود ظاہری جو محض وہم و گمان اور قابل فنا ہے جو وجود

حقیقی ابدی کے متناقض ہے اس لئے یہ خود میری فنائیت اور حقیقتاً موجود نہ ہونے کی دلیل ہے۔

چنانچہ گرامی نے اس طرز فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر کہا ہے۔

بود و نبود ماہمہ ہیچ است اے حکیم
یعنی بشاخ شعلہ بود آشیان ما

یعنی ایک دانا و بینا پر یہ خوب واضح ہے کہ ہمارا ہونا یا نہ ہونا کیا حقیقت رکھتا ہے۔ جب ہمارا آشیانہ ہی شاخِ شُعلہ پر ہے تو بنیاد کیسی؟ گھر کیسا؟ لہٰذا میں سمجھتا ہوں میرا وجود یا فنا ہونا یہ بھی کوئی قابل ذکر چیز ہے؟

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا ٥ یعنی انسان پرایک ایسا وقت ضرور تھا کہ جب وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔ جسے ظہور میں لانے کے بعد قوتِ سماعت و بصارت سے متصف کیا گیا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا:۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَو مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَیْبَةً ٥ " اللہ سبحانہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا فرمایا اور پھر ضعف کے بعد قوت بخشی اور پھر قوت سے تمہیں پھر ضعف میں مبتلا کیا اور بڑھاپے سے دوچار کیا"۔

ضعف کی وضاحت:

شیخ اکبر علیہ الرحمہ نے فص شیبہ میں اس آیت کی تفسیر یوں

بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ جو فرمایا کہ تمہیں قوت کے بعد پھر ضعف کو لوٹایا گیا اور بڑھاپے سے دوچار کیا گیا۔ اس ضعف سے مراد ضعف اصلی ہے۔ جس کی طرف انسان لوٹایا جاتا ہے اور یہ ضعف کی ایسی صورت ہے جس سے انسان جب دوچار کیا جاتا ہے تو پھر اور طفل ناتواں میں کوئی فرق نہیں رہتا بلکہ ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔

مولانا جامی علیہ الرحمہ نے اس کو مزید واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت مقدسہ میں جس ضعف کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ضعف نہیں جس کی طرف شیخ فرتوت کو قوت ملنے کے بعد لوٹایا جاتا ہے جس کی موجودگی میں طفل بھی قوی نہیں کہلا سکتا بلکہ اس ضعف کا مطلب انسان پر ایسی حالت کا طاری ہوتا ہے جس کی موجودگی میں اس سے کچھ ہونا متصور ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی ضعف، ضعف اصلی ہے جس کی جانب لوٹائے جانے کا ذکر آیا، متذکر بالا میں ہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمَرِ لِکَیْلَا یَعْلَمُ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا۔

''پھر انسان کو ایسی عمر کی جانب لوٹایا جاتا ہے جہاں اس کی فہم و فراست کی ساری توانایاں ناکارہ ہو جاتی ہیں''۔

اس لئے اوّلاً انسان پر وہ عدم میں ہونے کی وجہ سے قابل ذکر چیز نہ تھا پھر درجہ ظہور میں آنے کے بعد اپنے اصل یعنی ضعف و بیچارگی جانب لوٹایا جائے گا۔ ایسے میں میرا ''ثبات'' یعنی وجودِ ممکن وجود

''عدموں'' کے درمیان ہے۔ خود بخود معدوم متصور ہوگا۔

''لِاَنَّ الْوَجُوْدَ بَیْنَ الْعَدَمَیْنِ عَلامٌ''۔ ''یعنی جب کوئی وجود دو عدموں کے درمیان ہوتا ہے تو وہ معدوم ہی ہوتا ہے''۔

پس گرامی نے اولاً قرار زمانہ کو جو ایک غیر مستقل چیز اور محض نفس حرکت ہے اور محدود بھی کو عدم سے تعبیر کر کے ظرف سے مظروف لے کر انتفائے علم یعنی عالم دنیا کی نفی کو خوب واضح پیش کیا۔

ثانیاً ''کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ''سوائے اس کی ذات اقدس ہر شے فنا ہونے والی ہے کے مصداق اس امر کی صراحت کی کہ وجود عالم (دنیا) بین العدمین ہونے کی وجہ سے از خود معدوم ہے۔

فائدہ نافعہ:

اس مقام پر علم وہبی سے سرشار گرامی نے اصحاب دانش و بینش کے مقام رفیع کو ملحوظ رکھتے ہوئے شان ''وقایہ'' کے لباس میں ملبوس ہو کر نہایت لطیف انداز میں ''نغمۂ وحدۃ الوجود'' بھی گنگنایا ہے۔ جس کی تائید شیخ اکبر علیہ الرحمہ کی تفسیر سے بھی ہوتی ہے۔

اللہ سبحانہ حکماً فرماتا ہے۔ وَاتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ۔''اور تم اپنے رب کی بارگاہ میں تقویٰ اختیار کرو، جس نے تمہیں پیدا فرمایا''۔

افضل المحققین، الشیخ الاکبر علیہ الرحمہ فصوص الحکم کے مطابق اس آیت میں مذکور حکم ''وَاتَّقُوْا'' کا معنی یوں بیان فرماتے ہیں فَکُوْنُوْا وِقَایَةَ الْحَقِّ فِی الذَّمِّ وَاجْعَلُوْهُ وِقَایَتَکُمْ فِی الْحَمْدِ اُدَبَاءَ

عَالَمِیْنَ۔ یعنی اے لوگو! تم ذم میں حق تعالیٰ کے لئے ڈھال بن جاؤ اور حمد میں اس کی ذات اقدس کو اپنے لئے ڈھال بنا لو تاکہ تم اصحاب ادب بن جاؤ۔

یعنی دنیا (عالمین) تمہارا صاحبان ادب و معرفت ہونا اس پر موقوف ہے کہ ہر ذم اپنی طرف اور ہر مدح و خوبی جانب حق تعالیٰ منسوب کرو۔ تاکہ صاحب ادب بن کر وجود حقیقی ووجود واحد کی حقیقت کے شناسا ہوسکو۔

سب سے بڑا مجاہدہ:

شانِ و دقایہ، علم و عرفانِ حقیقی کا ایک نوری جلوہ ہے۔جو قلب انسان میں تزکیہ نفس اور تصفیہ ظاہر و باطن کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا جن کا واحد ذریعہ راہِ سلوک وطریقت میں پوری جانفشانی اور مجاہدہ نفسی ہے۔ اس لئے اہل عرفان کے نزدیک سب سے بڑا مجاہدہ اور تمسک بالطریقت یہ ہے کہ بندہ خود کو معدن نقائص ٹھہرا کر حق سبحانہ وتعالیٰ کو مجمع کمالات اور ہر اعتبار لائق حمد یقین کرے تاکہ اس طرح اصلاحِ کلی کے بعد بندہ صحیح معنوں میں ''متخلق با خلاق اللہ'' کے زیور سے آراستہ ہو سکے۔

مجاہدہ کا یہی فلسفہ شیخ اکبر علیہ الرحمہ نے الحکمۃ الاحدیہ کے کلمہ ''ھوویۃ '' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔ ھٰذہ الحکمۃ الاحدیۃ من عِلم الْاَرْجُل یعنی یہ حکمت احدیہ علم ''اَرْجلْ'' سے ہے۔ یعنی محنت شاقہ یعنی مجاہدہ کی یہ منزل راہ طریقت میں سلوک مسلسل، عمل پیہم سے

میسر آتی ہے ورنہ نہیں چنانچہ بطور استدلال کتاب مجید کی آیت پر غور کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّھُمْ اَقَامُوْ التَّوْرَاۃَوَالْاِنْجِیْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَیْھِمْ مِنْ رَّبِّھِمْ لَاَکَلُوْا مِنْ فَوْقِھِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِھِمْ۔ یعنی اگر بنو اسرائیل تورات و انجیل اور جو ان کی جانب ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا (قرآن) کے احکام پر (صدق دل سے) عمل پیرا ہوتے تو وہ اپنے اوپر قدموں کے نیچے سے رزق پاتے۔

یہاں رزق از پائے خویش سے مراد یہی ''عِلم اَرْجَل'' ہے جو کہ عمل مسلسل اور جادۂ مستقیم پر استقلال سے قائم رہتے ہوئے نصیب ہوتا ہے اور عالم شہود میں اس کی ذات بے ہمتا کی معرفت اور شان احدیت کو پہچاننے کے لئے کامل ذوق سے میسر آیا ہے نیز یہی مطلب ''مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ'' کی بادہ پیمائی اور ''عَلَّمَہٗ اللّٰہُ مَا لَا یَعْلَمُ'' کی منزل مقصود تک رسائی کا۔ ورنہ معرفت حق اور شان احدیت کا عرفان ناممکن ہے۔

یوں ہی اصحاب اتقا و ادب نے اللہ سبحانہ کے فرمان ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ'' کہ میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ کا معنی بھی ہی بیان کیا ہے کہ بندہ خود کو سراپا نقص اور ذاتِ حق کو مجمع کمال جانے اور مانے۔

ورنہ شان و قایہ کے بغیر تو عبد و معبود میں عبودیت عبد کی

اعتباری سی نسبت بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ شانِ وقایہ یہی ہے بندہ جس کی بدولت اپنی عبدیت محضہ کے ادراک، اس کی شان احدیت کی مکمل معرفت اور پھر ہر ہر شے میں اس کے جلووں کے مشاہدہ کا متحمل ہو سکتا ہے بنابریں اہل عرفان ''عبادت'' کے ''معرفت'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

چنانچہ امام ابو القاسم قشیری علیہ الرحمہ آیت مذکوہ کی تفسیر میں ''لِیَعْبُدُوْنَ' کا ترجمہ ''لِیَعْرِفُوْنَ '' سے کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی معرفت نامہ ''ہمہ اوست'' کا مظہر ہے۔

اشکال اور اس کا حل:

اگر کہا جائے کہ ''ہمہ اوست'' کے نظریہ میں موجود حقیقی صرف حق تعالیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں تو پھر خالق و مخلوق کا یہ تغایر جو ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ کیا ہے؟

حقیقت عالَم:

اوّلا اس عقدہ کے حل کے لئے سب سے پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ وہ عالَم کیا ہے؟ اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ ''عالم، نسبت الی الحق ایسے ہی ہے جیسے کسی شخص کا سایہ''۔ سایہ اپنے وجود میں ہمیشہ اس شخص کا تابع اور محتاج ہوتا ہے، جس کا یہ سایہ ہے۔اس کے بغیر سایہ کا وجود تو کیا اس کا ظہور بھی ممکن نہیں۔ اب جیسے سایہ کا ظہور شخص کے وجود کے بغیر محال ہے۔ ایسے ہی اُسے بڑھنے کے لئے بھی ایک مقام امتداد کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر اس کے

بڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

یوں ہی عالم شہود، دراصل حق تعالیٰ کے وجود حقیقی، جو کہ ثابت ازلی ہے کا ظل اور سایہ ہے اس کے بغیر یہ بالکل معدوم ہے۔ نیز اس کو اپنے بڑھنے کے لئے اس بے کیف مقام استعداد ازلی (وجودِ حق) کی سخت احتیاج ہے۔ لہٰذا بصورت اعیان زایۃ (عالم دنیا میں جو کچھ) موجود ہے یہ حق تعالیٰ کے وجودِ حقیقی کا مظہر اور سایہ ہے اور حق تعالیٰ کا وجود حقیقی بصورت مقام استعداد موجود ہے ورنہ عالَم خارج میں ظہور پذیر ہو سکتا تھا اور نہ ہی وجود خارجی کی بو پا سکتا تھا۔

چنانچہ نصِ شمیسہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان کیا ہے۔

''اگر خارج میں مقام استعداد نہ ہو تو پھر کسی ہستی کا سایہ جس کی طوالت اپنے مرکز سے طول پکڑتی ہے، کو فی نفسہٖ موجود کیسے مانا جا سکتا ہے اور شے کا سایہ جو آفتاب کی شعاعوں عدم انعکاس کی وجہ سے بظاہر نظر نہیں لیکن ہوتا ضرور ہے وہ بھی فی الحقیقت وجود شمس کا مرہون منت ہے ورنہ تو امر معدوم ہے''۔

فلسفہ رومی:

مولانا روم علیہ الرحمہ نے اس مسئلے کو یوں بیان کیا ہے۔

ہر چہ جز آں وچہ باشد ہالک است
ملک دمالک عکس آں یک بالک است

اس ذات حق کے سوا جو کچھ ہے سب فانی ہے۔ دنیا میں یہ مملکت و

تاجداری کا (عارضی) تصور بھی اسی مالک حقیقی کا جلوہ ہے۔

گرچہ سایہ عکسِ شخص است ای پسر
ہیچ از سایہ نا تانے خوردیُسر!!

مانا کہ سایہ بھی کسی شخص کا عکس ہوتا ہے۔ لیکن اے بیٹے! صرف سائے کے وجود سے تو پھل نہیں کھایا جا سکتا۔

بین زسایہ، شخصی رامی کُن طلب
در مُسبب رَدْ گذر کن از سبب

اس لئے تو بھی سایہ کو چھوڑ کر اس ذات کو طلب کر جس کا وہ سایہ ہے۔ یوں ہی اسباب سے ہاتھ اٹھااور اس مسبب الاسباب کا دامنِ کرم تھا۔

(ثانیاً) یہ کہ ''عالم صورت'' وجودِ حق کے آئینہ میں سے منعکس اعیان ثابتہ کا اپنا ہی انعکاس ہے یا یہ کہ وہ صورتِ حق ، جو ہے تو واحد، مگر اعیان ثابتہ کا ہر ہر انعکاس اس کے آئینہ وحدت اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے بہر شان منعکس ہو رہا ہے۔

بنا بریں کہا جائے گا کہ صورتِ حق کثیر و مختلف نہیں ہوئی بلکہ کثرت کا وقوع اور استعداد کا اختلاف و تفاوت ، صور عالم میں اختلاف و تفاوت سے واقع ہوا ہے۔

پس اہل تحقیق پر یہ خوب واضح اور ظاہر ہو چکا کہ آئینہ میں منعکس ہونے والی صورت ایک لحاظ سے موجود ہوتی ہے تو دوسرے لحاظ سے معدوم بھی۔ ایک پہلو میں ثابت ہے تو دوسرے پہلو میں منفی بھی۔

ناچیف فصوص الحکم کے بعض مقامات میں یہ صراحت موجود ہے۔

"یعنی وہ صورت جو آئینہ میں منعکس ہوتی ہے وہ اپنے معائن کے وجود سے موجود ہوتی ہے ورنہ فی نفسہٖ تو معدوم ہے"۔

یہی مثال عالم کی ہے کہ عالم موجود ہے، وجودِ حق کے اعتبار سے، ورنہ فی نفسہٖ، با عتبار ذات تو معدوم ہے۔ سو اس لئے جب اس کا موجود ہونا اس وجودِ مطلق سے جدا کر کے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو پھر وہ اپنے انعدام میں بھی کسی دوسرے وجود کا محتاج کیوں ہو۔ اس لئے عَالم کا عدم بھی اسی وجود حقیقی (وجود حق تعالیٰ) کا مرہون منت ہے۔

پس ہمارا دعویٰ بھی صرف اتنا ہے کہ عَالم "عینِ حق" من حیث الوجود اور "مغائر حق" من حیث العدم۔ اور اسی معنٰی عدمیت سے ہم خالق و مخلوق میں مغائرت کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔

تمہید شعر ثانی:

با عتبار عدم، خالق و مخلوق میں ثابت تغایر کا یہ مضمون گرامی کے اگلے شعر کی خود تشریح کر رہا ہے ۔ یہاں انہوں نے ارباب تصوف کی اصطلاح کے مطابق عدم کو ظلمت اور وجود کو نور سے کیا ہے اور کمال خوبی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

دوسرا شعر:

کلبۂ☆ تاریک من، مَنّت کشِ خورشید نیست
صبح محشر سایۂ پرورد، شب یلدائے مَن!

مفہوم:

میرا یہ تاریک جھونپڑا (وجود ِمن) جو کہ اپنی ذات میں ہی لائق عدم ہے۔ یہ اپنی شان عدمیت میں کسی خورشید (وجودِ آخر) کا احسان مند کیوں ہو۔ کیونکہ صبح حشر کا ظہور (نور) بھی تو میری طویل شبِ دیجور کے سائے سے نکلا ہو گا۔ (اب اس اختصار کی تشریح ملاحظہ فرمائیں)۔

سر بقائے حق:

ظلمت و تاریکی سے اَٹا ہوا میرا آشیانہ وجود جو اپنی ذات میں قابل عدم ہے۔ وہ بھلا اپنی عدمیت میں کسی خورشید (وجود) کا ممنونِ احسان نہیں کیونکہ صبح محشر کی تمازت اور اس کا ظہور خود میری رات کی ظلمت سے ظاہر ہونے والا ہے۔ یعنی خود وجود محشر کا ظہور بھی تو میرے معدوم ہونے میں مظہر ہے یعنی میرا وجود بھی جو ایک ماہیت ممکنہ ہے۔ وہم ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔

چنانچہ قرآن عزیز میں وارد ہوا۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ کیا انسان پر ایک زمانہ ایسا نہ تھا؟ کہ جس وقت وہ کوئی قابل ذکر چیز ہی نا تھا۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان کا عدم یقینی ہے بلکہ اگر (بزعم خویش) یہ اپنے لئے فی نفسہٖ کوئی وجود ثابت کرتا ہے اور اس کا یقین کرتا ہے تو پھر اس کو وجود حق کا عرفان نصیب نہیں ہوگا۔

اوپر مذکور ہوا کہ اصفیاء کاملین عدم کو ظلمت اور وجود کو نور سے تعبیر کرتے ہیں اس لئے انسان اگر اپنے وجود کا یقین کرے۔ جو کہ نور کے مترادف ہے تو پھر یہ وجود حق جو کہ نورِ حقیقی ہے کو کیسے پہچان سکے گا۔ چنانچہ **تعرف الاشیاء باضدادھا** ''کہ اشیاء اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہیں''اس طرح انسان بھی اپنے معدوم ہونے کے یقین سے ہی وجودِ حق (نور) کی معرفت پا سکتا ہے۔

اس لئے گرامی کہتا ہے صبح محشر کا ظہور جس میں وجودِ حق (نورِ کامل) پورے جلال اور کمال سے جلوہ نما ہو گا وہ بعد از شب یلدائے من یعنی میرے عدم و فنا کے بعد ہی ہوگا۔

انتباہِ لطیف:

بادی النظر محسوس ہوتا ہے کہ جو مفہوم ہم نے شعر ثانی سے اخذ کیا ہے شعر اوّل کا مفہوم بھی یہی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں مفہوموں میں بہت لطیف سا فرق ہے۔ جو کہ اہل کنایات و اشارات قابل اعتبار ہے۔

مخفی نہ رہے کہ شعر اوّل جس میں شاعر نے شانِ وقایہ کو محفوظ رکھا تھا اور شعر ہاں میں اپنی فنائیت تامہ اور عجز کو کمال انداز میں بیان کیا ہے۔ جس میں اس کا یہ تسلیم کرتا مذکور ہے کہ

''کلبہ من یعنی میرا وجود دنیا ارتکاب معاصی اور ظلمت باطنی کی وجہ سے اس حد تک تاریک ہو گیا ہے کہ وہ نور ہدایت قبول کرنے کی

استعداد بھی کھو بیٹھا اور اس کی یہ محرومی اور ظلمت قیام قیامت اور صبح محشر کے ظہور کا سبب بن گئی گویا میری ظلمت و عصیان کی ہی قیام قیامت اور صبح محشر کے وقوع کی علت تامہ ہے''۔

تمہید شعر نمبر ۳

اب شاعر محقق کمال مہارت سے مفہوم اوّل سے اعراض کرتے ہوئے ذیل کے شعر میں (اپنی درماندگی) کو بھی استغنائے خویش سے بیان کرتا ہے۔ اور یہ استغناء کا مفہوم ان کے پہلے تمام مفاہیم پر حاوی ہے جسے الفاظ کے تمام احتمالات و وجوہ سے خوب سمجھا جا سکتا ہے۔

مزید وہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ فقط الفاظ کے گورکھ دھندے میں محصور رہنا تو ظاہر بینوں اور کوتاہ اندیشوں کا کام ہے۔ جو بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ کے الفاظ سے مخاطب ہیں اور لفظی مباحث میں کھو جانا تفرقہ اور انتشار ذہنی کے ساتھ ساتھ جمعیت خاطر اور وحدت و یکسوئی کے سخت منافی ہے۔ لہٰذا الفاظ میں اٹک کے رہ جانا سراسر جہالت ہے۔

چونکہ اس تفرقہ اور انتشار قلبی کو ختم کرنا مقصد عظیم اور ایمان و علم کا حقیقی منشاء بھی ہے اس لئے گرامی کے نزدیک مفہوم اوّل (شان و قافیہ اور اپنی درماندگی) سے اعراض اور مفہوم ثانی (استغنائے خویش) کو اختیار کرنا ضروری ہو گیا۔ اب اپنے اصل مدعا کی وضاحت اور کسوت الفاظ میں کھو جانے کی تحقیر و مذمت کرتے ہوئے زور کلام میں ایک

مخصوص ربط کا لحاظ کر گویا ہیں۔

تیسرا شعر

برد☆ حرف آشنایاں سرنمی آرم فرود
کوس معنی زدا دب☆☆ بربام استغنائے مَن

مفہوم:

یعنی میں صرف اُن ظاہر میں اور مبحث حروف میں الجھنے والوں کے در پر سرا فگند نہیں ہوا ہوں جو کہ بے معنی اور غیر مستقل اُمور کو اپنا راس العین قرار دے لیتے ہیں۔ بلکہ زلات و خطاسے یا محفوظ علم و معرفت کی تجلیات نے میری بام فکر و دانش پر ایسی دستک دی ہے کہ اس (موہبت سرمدی) نے مجھے ان سب سے بے نیاز وغنی کر دیا ہے۔ اور میں ان کی دریوزہ گری اور اطاعت سے دستکش ہو چکا ہوں۔

تشریح:

گرامی کا مدعا یہاں خوب نکھر کر سامنے آ گیا کہ راز آشنا اہل حق کے اتباع اور ان کی تجلیات و انوار نے میرے فکر و تخلیل کو وہ اَوج و سر بلندی بخشی ہے کہ جہاں پہنچ کر میں ہر ماسوی اللہ سے مستغنی ہو کر نقارِ حقیقت بجا رہا ہوں۔

بغور دیکھا جائے تو اشعار متذکرہ بالا کا حقیقی معنی و مطلب بھی یہی دوسرا مفہوم ہے جس کی جانب گذشتہ بحث میں اشارہ کی جا چکا ہے۔

تمہید شعر ۴:

معرفت حقیقی کا اصل سبب معرفت نفس ہے۔ اور کامل معرفت

نفس پر ماسوی اللہ سے استغنا کے ادراک اور یقین محکم سے ملتی ہے۔
گرامی نے گزشتہ اشعار میں بطور اجمال اس کی جانب اشارہ کیا اور
اپنے آئندہ شعر میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہے اور ساتھ میں اپنے
دعویٰ اور عالم من حیث الوجد عین حق ہے کو مزید نکھار کر بیان کرتا ہے۔

چوتھا شعر:

ہستی من، مستی منصور دارد در دماغ
مے چکد خونِ انا الحق، ازلب گویائے من☆

(اس شعر کی شرح حضرت شارح علیہ الرحمہ دوطرح بیان کی ہے)

اوّل:

یعنی میرا عرفان نفس کا ملکہ اپنی اس حقیقت پر مطلع ہو چکا ہے
کہ اُسے شاہ منصور علیہ الرحمہ کی ذوق و مستی اور خودرفتگی جو کہ فی
الحقیقت حقائق پر آگاہی اور معرفت حقیقی سے عبارت ہے، سے ایسی
مشابہت حاصل ہو چکی ہے کہ ان کا مذاق باطنی پوری طرح میرے من
میں جلوہ گر ہو چکا ہے۔ نیز حقیقت نفس پر آگاہی نے مجھ پر حقائق
اشیاء اور معرفت حق کا دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہ‘
فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہ‘ ''جس نے خود کو پہچانا، حقیقت میں اس نے اپنے
رب کو پہچان لیا'' کا نور کلی طور پر میرے دل میں جاگزیں ہوگیا ہے۔
لہٰذا قلب میں کسی اور کی گنجائش کہاں؟ اس لئے میں کہتا ہوں کہ شاہ
منصور رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا خون ناب جو بوقت نعرۂ ''انا الحق'' بہایا تھا

جو آج میرے لبوں سے بھی ٹپک رہا ہے۔ اس کامل مشابہت کی وجہ سے جو آپ سے مجھے حاصل ہو چکی ہے میں بھی اہل ظواہر کی ہم نوائی سے معذور ہوں۔

سو جس طرح شاہ منصور علیہ الرحمہ کو اس نعرۂ مستانہ ''انا الحق'' کی پاداش میں جب شہید کر دیا گیا تو صفحہ ہستی پر ان کے خون سے ''انا الحق، انا الحق'' مرقوم و منقوش ہوتا گیا تھا۔ آج مجھ پر بھی وہی کیف و مستی طاری ہے لہٰذا میں بھی مجبور ہوں اور بایں حال سے نغمہ ''انا الحق'' اَلاپ رہا ہوں اس کے بدلے میں مجھ پر طعن و تشنیع کے تیر برسائے جائیں یا حرف گیری تو کیا غم؟ میں پھر بھی کہوں گا۔ ''مے چکد خونِ انا الحق، ازلب گویائے مَن''۔

ثانیاً:

بالفظ دیگر اس شعر کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا کہ گرامی کہتا ہے۔ میرا تن، من، دھن حقیقتاً شاہ منصور علیہ الرحمہ کی کیفیت سے اس طرح منعکس ہو چکا ہے کہ گویا میں بھی ان کی طرح ''من الوجود عین حق'' ہو گیا۔ اس لئے ان کا نعرۂ ''انا الحق'' گویا آج میرے لبوں پر جاری ہو گیا ہے۔☆

شعر نمبر۵:

چوتھے شعر میں گرامی کا زور کلام ''عدم خویش'' کے اعتراف سے ''انا الحق'' کے دعویٰ پر منتج ہوا ہے جو کہ ''انا موجود'' کے مترادف

ہے یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کے خلاف ہیں اور یہ قانون اصولیوں کے نزدیک مسلم ہے کہ شئی واحد میں وجود و عدم کا جمع ہونا امر محال اور باطل ہے جس وجہ سے ان کا دعویٰ اور ''عدم خویش'' کا اعتراف از خود باطل ہو جاتا ہے۔ اب وہ اس گتھی کو اپنے ذیل کے شعر میں کیسے سلجھاتے ہیں۔ سنیئے

پانچواں شعر

نفیِ اثباتِ مرا، اثباتِ نفی من دلیل
معنی ''لا'' جوش زد از جوہر الائے من ☆

تشریح اوّل:

میں اپنے اثبات یعنی ثبات کے اعتبار سے نفی یعنی عدم سے وجود میں منتقل ہوا ہوں۔ اور جو چیز عدم سے اثبات (وجود) میں آتی ہے۔ عدم کا معنی بہرحال اس میں مرتکز رہتا ہے۔ اس لحاظ سے میرا ظاہری وجود ممکن ٹھہرا اور ہر ممکن قابل عدم ہوتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ میرے اثبات (وجود) میں نفی (عدم) لازمی ہویدا ور ظاہر ہے۔ بلکہ کسی ظاہری وجود (ممکن) پر اثبات کا اطلاق درست ہی تب مانا جائے گا کہ وہ قبول نفی یعنی کی استعداد سے خالی نہ ہو۔ اس لئے گرامی کا یہ کہنا درست ہے کہ ''نفی اثبات مرا'' جو کہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ لہٰذا یہ خود ہی ''اثبات نفی من'' کی دلیل ہے۔

تقریر ثانی:

میرا ''اثبات'' یعنی وجود ممکن، اپنی نفی کا خود متقاضی ہے۔ اس کی دلیل خود ''میری نفی'' کا اثبات ہے۔ یعنی جب نفی اثبات، اور اثبات نفی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور قانون یہ ہے کہ دونوں ضروری میں سے کسی ایک کے ارتفع سے دوسری کا تحقق ضروری ہوتا ہے۔ تو ''نفی کے اثبات'' کے اجتماع کے منافی ہے۔ نقیض اوّل جب مرتفع ہوگی تو نقیض آخر ''نفی کا اثبات'' ضرور ثابت ہوگی۔

اشکال اور اس کا جواب:

البتہ اس تقریر پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ اشکال: ''جب ''اثبات'' یعنی وجود نفی یعنی عدم میں ظاہر ہوگا یہ بھی تو اجتماع نقیضین کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ محال ہے اور جو شے امر محال کو مستلزم ہو۔ اس کا اپنا استحالہ ضرور ٹھہرتا ہے۔ پس اگر ''اثبات نفی' کا مرتفع ہو بھی گیا تو ''نفی اثبات'' جو کہ ''اثبات نفی'' کی ضد پھر بھی ظاہر و ثابت ہوگی۔ اس طرح کلام شاعر ''نفی اثبات من'' پر وہی سابق اعتراض جو ''دعویٰ انا الحق'' کی صورت میں وارد ہوا تھا۔ اسی طرح بدستور باقی رہے گا۔

جواب: اس اعتراض کا رفع بایں صورت ممکن ہے کہ جو شے ممکن ہو۔ قطع نظر اس کے وجود و عدم بالعقل کے وہ اپنی ذاتی استعداد کے اعتبار سے وجود و عدم دونوں کو برابر چاہتی ہے۔

لہٰذا جب صفت وجود سے بالفعل متصف ہوگی تو قابلیت عدم اس

میں برابر طور پر باقی رہے گی اور جس وقت وہ صفت عدم سے متصف بالفعل ہو گی تو جانب وجود لوٹنے کی صلاحیت اس پر باقی مانی جائے گی۔ کیونکہ وجود و عدم دونوں کا اقتضاء اس کا لازمہ ذاتی ہے اور جو وصف کسی شے کا لازمہ ذاتی ہوتا ہے وہ اس سے کبھی مرتفع نہیں ہو سکتا ہے۔

ہاں البتہ بوقت وجود عدم اس میں بالفعل نہیں ہوگا اور بوقت عدم، وجود اس میں بالفعل نہیں ہوگا۔ جبکہ دونوں وصفوں کی صلاحیت و قابلیت بالقوہ اس میں بہرحال باقی اور مسلم ہے۔

بایں صورت استحالہٗ اجتماع نقیضین کا اعتراض بھی اُٹھ گیا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ دونوں نقیضوں میں ایک کا تحقق، نقیض آخر کی صورت بالفعل کو مرتفع کرتا ہے نہ صورتِ استعدادی کو۔

ایک مثال:

مثلاً نابینا کہ ضد ہے بینا کی۔ اس کو کہا جاتا ہے جس میں بینائی کی استعداد و قابلیت تو باقی ہے مگر اب بوقت عدم بصارت ، بینائی بالفعل اس میں موجود نہیں لیکن وہ اصلاً استعداد بصارت سے محروم نہیں۔

پس فرمودہٗ گرامی پر غور کیا جائے وہ بھی یہی کہتا ہے کہ ''وجودِ من'' یعنی میرا ظاہری وجود، موجود ہوتے ہوئے بھی میری استعداد عدم بالقوۃ کو زائل نہیں بلکہ صرف میرے عدم بالفعل کو اُٹھاتا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ثابت ہو گیا کہ اثبات من یعنی میرا وجود ظاہر بمطابق قانون فطرت ہمیشہ اپنے انتفاء (عدم) کے لئے مستعد رہتا ہے۔

اب غور فرمائیں ''معنیٰ لَا جوش زد، از جوہر الائے مَن'' پر کہ کلمہ طیبہ میں ''اِلَّا'' لَا اِلٰہَ ، میں مذکور نفی کے بعد اثبات کے لئے ہے۔ حقیقتاً ''اِلَّا'' معنیٰ ''لَا'' میں صورۃً اور معناً دونوں طرح موجود ہے۔ ورنہ ''اِلَّا'' سے اثبات کیسا؟ اور کس کا؟ نیز یہ کہ لفظ ''اِلَّا'' مجمع صفات کمال کے ثبوت کے لئے وارد ہے اور کمال الوہیت صرف اسی میں ہے کہ ہر موجود ماسوی اللہ کلی طور پر منتفی ہو جائے ورنہ کمال الوہیت، نقصان سے مبتدل متصور ہوگا۔ العیاذ باللہ من ذلک۔

پس ثابت ہوا وہ وجود حقیقی ، ازلی، ابدی (وجود حق تعالیٰ) اپنی ذاتی حیثیت میں ہر وجود آخر کے انتفاء کا مقتضی ہے۔ سو کلمہ طیبہ میں ''اِلَّا'' مفید اثبات بھی اور معنیٰ ''اِلَّا'' کا جامع بھی۔ یہی کہتا ہے گرامی کہ '' لَااِلَّا'' کا جوش ''الائے مَن'' کے جوہر سے۔ یعنی '' لَااِلَّا'' سے ہر ماسویٰ اللہ کی نفی کا کامل ظہور میرے ''لَااِلَّا'' کی تسلیم میں پنہاں ہے۔ یہی مقام واحد میں اجتماع نقیضین کی واضح مثال ہے۔

چنانچہ پیغمبر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ سے ثابت ہے کہ نفی و اثبات معناً وصورۃ بیک وقت وجود واحد میں موجود ہو سکتے ہیں۔ مروی ہے۔

''آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی کمر مبارک کو کمر بند باندھا گیا لیکن کمر بند کمر مبارک سے باہر نکل آیا حالانکہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اطہر آنکھوں سے دیکھا جا رہا تھا کہ جسم انور

تو موجود ہے (مگر کمر بند علیحدہ ہو جاتا)''

12

اجتماع نقیضین مظاہر حق سے ہے:

واضح رہے کہ جمع دلائل قطعی مظاہر حق سے ایک عجیب مظہر ہے۔ دیکھئے حق تعالیٰ جو ہر تشبیہ و تمثیل سے پاک ہے لیکن وہ ذات و لحد قہر و عنایت اور تنزیلے و تشبیہ کی جامع ہے۔ فرمایا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۔ نہیں کوئی مثل اس کی اور وہ سمیع ہے اور بصیر بھی۔ یعنی وہ ذات حق کہیں روائے تنزیہ اور کہیں شانِ تشبیہ میں ظہور فرما کر عین واحد میں جلوہ سماں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ بالا میں حرف مثل ''کاف'' کو اگر زائد تصور نہ کیا جائے تو جزو اوّل آیت کریمہ شان تنزیہ اور کمال تشبیہ دونوں کا جامع ہے۔

بحمد للہ! ان حجج قاطعہ کی قوت سے معترض کا شجر قیاس (استحالہ اجتماع نقیضین) بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک دیا گیا ہے۔

نیز غور فرمائیں کہ کلام گرامی کس قدر بلیغ ہے کہ انہوں نے شعر کی ہیئت ترکیبی میں ''اثبات'' کو دونفیوں کے جز میں لا کر یہ بتا دیا کہ اثبات بین النقیضین خود بخود منتفی متصور ہو تا ہے۔ کیونکہ دونفیوں کے جز میں اثبات نہ صرف نفی کا متقاضی ہوتا ہے بلکہ خود ہی نفی کے حکم میں ہوتا ہے۔

سو ذاکر جب ''لا'' کی تیغ سے اپنی ہستی اور ہر ماسویٰ اللہ کی نفی کرتا ہے تو پھر وجود حق میں مستغرق، اور اس کے عشق و محبت میں فنا

ہو کر اپنے وہم خودی کے بتکدے سے نکل جاتا ہے۔ اور اس عالم خودرفتگی میں وہ بہر سو ذات حق کے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے مخدوم و مرشد الشیخ شاہ محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ''چہل رسائل'' میں بیان کیا ہے۔ ''عشق وقتے کہ درست گردد اعتبارِ عاشق و معشوق مرتفع سود''۔

یعنی عشق جب کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر عاشق و معشوق کا اعتباری امتیاز اُٹھ جاتا ہے۔

زدریائی شہادت چوں نہنگ ''لا'' بر آردسر
تیمم فرض گردد نوح را در عین طوفانش

یعنی بحر شہادت سے نہنگ ''لا'' نے جونہی سر باہر نکالا۔ تو اس عالم تحیرّ میں بوقت طوفان بھی نوح کو تیمم کے بغیر چارہ رہا۔

تمہید شعر نمبر۶:

اب وہ تضاد جس کی تفصیل بمعہ سوال و جواب ہم نے بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اُسے گرامی کس قدر چستی سے اُٹھاتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

چھٹا شعر

ہاں بخود وارفتگاں از جادۂ برکردہ سر
عشق ، عقل آموز من، عقل، جنون فرمائے مَن

مفہوم:

یعنی اے راہ عشق میں خود سے بیگانہ! (یہ کیسی معنی خیز حقیقت

ہے) کہ عشق اور عقل باوجود باہمی طبعی میلانات کے دونوں ایک ہی مقام سے جلوہَ ناز ہو کر (بصورت استاذ) اپنے اپنے مزاج طبعی کے خلاف) مجھے ایک دوسرے کے بارے میں درس دینے لگے ہیں یوں کہ عشق، مجھے عقل وشعور کا اور عقل مجھے درس جنون دے رہا ہے۔

(تو پھر غور کرو، عین واحد میں یہ اجتماع نقیضین نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی کا تذکرہ گرامی اپنی سابق کلام میں کر چکے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس نازک خیالی کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے عشق اور عقل کی وضاحت ضروری ہے تاکہ شعر کا مفہوم بہ آسانی ذہن نشین ہو سکے۔

عشق کی پہلی تفسیر:

ہمارے مخدوم و مرشد حضرت خواجہ مولانا الشیخ شاہ محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجموعہ چہل رسائل کے چھتیسویں حصہ میں بیان کیا ہے۔

''عشق میں سب سے پہلے جس چیز کا اعتبار کیا گیا ہے۔ قطع نظر اس کے پوشیدہ رہنے یا ظاہر ہونے کے۔ وہ عشق، عاشق اور معشوق دونوں کا وصف ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا۔ حق جل ثنانہ فرماتا ہے۔

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ۔ میں مخفی خزانہ تھا تو مجھے محبوب ہوا کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

اس حدیث قدسی سے ہمیں معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو ''عرفانِ خویش'' کی محبت وعشق قطع نظر اس کے ظہور یا بطون کے عاشق اور

معشوق کے تعین سے قبل ہوا۔

بعد میں بصورت عاشق ظاہر ہوا اور بصورت معشوق بنا رہا۔ یعنی عشق میں محبت کا وصف بایں وجہ معتبر ٹھہرا کہ اس میں ظہور پذیر ہو رہا ہے اور پردۂ معشوقیت میں بایں اعتبار معتبر ہوا کہ اس میں پوشیدہ اور مخفی ہوتا ہے۔

لیکن دونوں میں اس کے وصفِ عشق ہونے میں اصلاً کچھ فرق نہیں اور یوں ہی پردۂ معشوقیت میں سے یہ وصف بایں جہت کہ اگر ظاہر ہو جائے تو فوراً عاشق کا روپ دھار لے اور اگر عاشقیت کی بیخودی پردۂ نہاں میں چلی جائے تو یہی شانِ معشوق میں ڈھل جائے گی۔

چنانچہ بغور ملاحظہ فرمائیں۔ حدیث قدسی مذکور اس راز لطیف پر بھی شاہد ہے کہ گویا وہ جوہر جو مستور حقیقی ہے کہتا ہے کنز بھی میں ہوں۔ عشق بھی ہوں اور بصورت معشوق جس کو اپنا عاشق بنا لیتا ہوں اسے تیغ نان سے قتل کر کے اس شہید محبت کا خون بہاء اپنے ہی ذمہ لے لیتا ہوں تو میں خود ہی اس کا خون بہاء بن جاتا ہوں۔ فللّٰہِ دُر القائل

خونِ من گر ریخت دوکویت چہ باک؟
خون بہائے ماست اندر کوئے او

یعنی مجھے اگر کوچہ یار میں قتل کر دیا گیا ہے۔ تو غم کیسا؟ کیونکہ میرا خون بہاء بھی تو اسی محبوب کے کوچہ ناز میں ہے۔ (رسالہ سی و ششم شیتا و

مرشدنا خواجہ شاہ محمد چشتی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ)

عشق کی تفسیر ثانی:

مکاشفۃ القلوب الکبریٰ میں لفظ محبت کی تفسیر میں مذکور ہے۔

''کسی پسندیدہ چیز کی جانب میلان طبعی کا نام محبت ہے اور جب یہ میلان طبعی پختہ اور طبعی پختہ اور قلب میں جا گزیں ہو جائے تو اسے عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عشق، عاشق کو اپنے محبوب و معشوق کے لئے اتنا رقیق القلب بنا دیتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ محبوب اور معشوق پر قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور یہی ''عشق ہے''۔

عقل کی تفسیر:

عقل کا معنی ہے ''باندھنا''۔اور یہ عِقَالُ الْبُعِيْرِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی جیسے رسّا اونٹ کو باندھ کے رکھتا ہے۔ ایسے ہی عقل اصحاب دانش کو صراط مستقیم سے ڈگمگانے سے روکے رکھتی ہے اور اسی ملکہ کو اہل علم کی اصطلاح میں ایسے نور سے تعبیر کیا گیا جو قلب (انسان) میں جب پیدا ہو جاتا ہے وہ اس کی بدولت حق و باطل کو پہچاننے کا اہل ہو جاتا ہے۔

سو حدیث قدسی مذکور سے یہ دونوں باتیں خوب عیاں ہیں۔

☆ عشق وہ وصف کامل ہے جو عشق اور معشوق کے وجود اور تعین سے قبل موجود ہو اور پھر تخلیق عالم کا سبب اولین ٹھہرا۔

نیز یہ کہ اوّل مخلوق عقل ہوئی۔ بنابریں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عشق ہی جو

آموزندہ عقل یعنی اس کا مربی و معلم اوّل ہے۔

☆ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوا۔ عقل ہی ہے جو حق و باطل کو پہچاننے کا ذریعہ اور صراط مستقیم پر قائم رہنے کا سبب ہے۔ چنانچہ کُلُّ شَیْءٍ یَّرْجِعُ اِلٰی اَصْلِہٖ کہ ہر شے اپنے اصل ہی کی جانب لوٹتی ہے۔

اس لئے عقل کا بھی ماننا اور یقین کرنا ہے کہ صراط سُوئے صرف اور صرف وہی ہے جو اسے اس کی اصل یعنی عشق تک پہنچا دے۔ کیونکہ وہی اس کی اصل ہے۔ لہٰذا حقیقت جنوں تک رسائی کے لئے کارفرما قوت وہ عقل ہے۔ اب واضح ہوا کہ عشق کامل وہ ہے جو مربی عقل ہو اور عقل راست وہ ہے جو کارفرمائے جنوں یعنی عشق ہو۔ اس سے ہمارا مقصود بھی مزید واضح ہو گیا۔

”عشق و عقل متحد و در یکجا جمع ہستند“

یعنی عشق اور عقل دونوں ہی دوئی ہستیں اور دونوں ایک ہی مقام سے جلوہٴ نما ہیں۔

سوال اور اس کا جواب:

بدیہاً اس مقام پر ایک وہم سا پیدا ہوتا ہے (جس کا ازالہ ازحد ضروری ہے) وہ یہ کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ عشق اور عقل جو کہ طبعاً ایک دوسرے کی ضدر رکھتے ہیں پھر دونوں یکجا اور باہم متحد کیسے ہیں۔

جواب: واضح رہے کہ عشق و عقل باہمی اتحاد، علت اور معلول کے اتحاد

کی طرح ہے۔ جیسے بظاہر علت اور معلول دونوں طرفین پر واقع مگر ایک دوسرے الگ الگ ہیں لیکن معلول کا وجود بہر حال علت کے وجود پر موقوف ہے۔ ایسے ہی عشق علت ہونے کی وجہ سے اپنے معلول یعنی عقل کے وجود کی اساس ہے۔

اس تعبیر سے مقام واحد میں استحالہ اجتماع نقیقین (جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے) کے وہم کے خاتمے کے ساتھ وہ اشکال جو علت و معلوم کے باہمی اتحاد کے بارے میں ظاہری رونما ہوا بھی تو رفع ہو گیا۔ اور واضح ہو گیا کہ

''عشق و عقل جو کہ حقیقتہً عین واحد (جسد واحد) کے حکم میں کیونکر ایک مقام میں متحد و یکجا نہ ہوں''۔

سو عقل، بہر عشق سے اسی طرح نمودار ہو رہا ہے۔ جیسے کہ ''اثبات من'' از نفی من اور ''وجود من'' از عدم من رونما ہوا ہے۔

نتیجہ بحث یہ نکلا کہ عشق و عقل اور نفی و اثبات کی تعبیرات سب ایک ہی حکم میں ہیں اور وجودِ حقیقی ازلی، ابدی صرف ذات حق جل شانہ یہی ہے اور ہر مقابل اس کا عدم محض ہے۔

لہٰذا وجود من اگرچہ اس کا ظہور عشق و عقل کی صورت میں ہو یا نفی و اثبات من کے انداز میں ''عین حق ہے البتہ بطریق حقیقت نہیں بلکہ بطریق انعکاس اور یہ کہ نفی پر نفی کے اجراء سے اثبات ہوتا ہے تو اثباتِ من کیا ہے صرف قبول وجود کی استعداد۔ بنا بریں کائنات کے

جمیع اعیان ممکن کو ہم جب اثبات سے متصف مانتے ہیں کہ وہ موجود ہیں تو اس طرح نہیں کہ وہ وجودِ عینی، حقیقی کے ساتھ موجود ہیں بلکہ وجودِ عینی، حقیقی جو کہ ذاتِ حق تعالیٰ ہے ، کے انعکاس کے طور موجود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندر صرف قبول وجود کی استعداد رکھتے ہیں۔ اب وہ وہم کہ گرامی کے شعر۔

ہستی من، مستی منصور دارد، درد دماغ
طے چکد خون انا الحق از لب گویائے من

سے پیدا ہوا تھا کہ من عین حق ہستم و موجود ہستم بوجود حقیقی'' بھی رفع ہو گیا۔

نیز واضح ہوا کہ اگرچہ میں ذاتی حیثیت میں ''چیزے نیستم و قدرے ندارم۔ ولے ہم یا قدر ہستم'' یعنی میں کوئی چیز نہیں ہوں اور نہ ہی کوئی قدر و منزلت رکھتا ہوں لیکن محبوب حقیقی و سروری میں گم ہو کر اور اس صاحب قدر کے سامنے ہر قدر سے بے قدر ہو کر ایسی قدر و منزلت حاصل کر چکا ہوں کہ ہر قدر میری بے قدری پر قربان ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ہمارے مخدوم و مرشد حضرت الشیخ نصیر الحق والدین، شاہ نصیر الدین المعروف ''چراغ دہلوی'' رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کیا خوب فرمایا۔

بیکارم و باکارم، چوں مُد بحساب اندر
گویائم و خاموشم چوں خط بکتاب اندر

میرا پیمانہ، جب گنتی میں آجائے تو میں بیکار ہوتے ہوئے بھی کار آمد ہوں اور کتاب میں تحریر کی مانند جب کسی کی نظروں میں آجاؤں تو پھر

خاموش رہتے بھی سب کچھ کہہ جاتا ہوں۔ نیز بقول گرامی

درکشمکش لائیم در جذبہ اِلائیم
ہیچیم و ہمہ مائیم چوں عکس یاب اندر

یعنی جب میں "اِلَّا اللّٰہ" (اثباتِ ذات) کے جذبہ سے سرشار ہوکر "لا" (نفی ہر ماسوئ اللہ) کی کشمکش میں کھو جاتا ہوں تب محویت کے اس عالم میں، کچھ نہ ہوتے بھی سب کچھ میں ہوں۔ بالکل ویسے، جیسے پانی میں عکس یارِ۔

شاعر ممدوح کی یہ بلند خیالی، ان کے دوسرے کلام سے بھی مترشح ہے۔

چنانچہ کہتے ہیں۔

نالۂ من، نالۂ نے را اسیر
رمز پنہاں سوختن را درس گیر

فراق یار اور نفی و اثبات کی سرمستی میں میرا نالہ وفریاد، بانسری کے نالہ و فریاد کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے (اے متلاشی حق) تو بھی اس سوز دروں کے راز پنہاں کو سمجھ اور اس سے سبق حاصل کر۔

ساخت یاد لہا و بودش ہیچ نیست
سوخت دلہارا و درویش ہیچ نیست

(بانسری کے اس سوز و ساز نے) کئی دلوں کے ساتھ ایسی موافقت و موانست اختیار کی کہ ان کی تعمیر سازی میں اپنا آپ مٹا دیا اور ہجر د

فراق میں ڈوبی اپنی سرمست آواز کی آتش سوزاں کتنے دلوں کو جلا کے راکھ کر ڈالا لیکن دھواں بھی نہیں اٹھنے دیا۔

نے کہ مے ناخوردہ، رند سرخوش است
در نظر چوب است، اَما آتش است

یہ بانسری، جو دیکھنے میں ایک چھید شدہ لکڑی ہے جس نے کبھی مے نوشی بھی نہیں کی۔ لیکن مستی سے سرشار اس رند کی طرح ہے جس کی مست آواز میں (عشق) کا آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔

آتشے در پردہ با دلہاش کار
داغ پنہاں سوختن را پردہ دار

(بانسری کا سوز) ایسی آگ ہے جو در پردہ دلوں کا شکار کرتی ہے اور (لطف یہ ہے) کہ ان کے سوزِ دروں کے داغ (عشق) کو چھپائے رکھتی ہے۔ آشکار نہیں ہونے دیتی۔

غیر نے ہم آتش وہم چوب کو
غیر نے خود سالک و مجذوب کو

بانسری؟ جو لکڑی کے علاوہ ایک آگ بھی ہے اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ سالک بھی خود ہے اور مجذوب بھی خود ہے۔

تمہید شعر ۷:

آیئے دیکھیں کہ شاعر ممدوح کیف و مستی سے معمور یہ مضمون اپنے ایک شعر میں کس رندانہ انداز میں مزید نکھار کر بیان کرتا ہے۔

ساتواں شعر

37 ذرۂ سرجوشم وَلے دارم، درآغوش آفتاب
گرد خود گردم بود، مجنون من، لیلائے مَن

مفہوم:

میرا جوشِ عشق جو بظاہر ہر حقیقی کا ایک ادنی سا ذرہ ہے لیکن اس کی بدولت عشق کے آفتاب و ماہتاب کو اپنی آغوش یوں لئے ہوئے ہوں کہ اس کی گردش کا مدار خود میں ہوں اور میرا مجنوں خود میری لیلیٰ بن چکا ہے اور میں اپنا طواف آپ ہی کر رہا ہوں۔

تشریح:

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عاشق اور معشوق دراصل ایک قالب یعنی عشق کے دو نام ہیں۔ فرق صرف ظہور و بطون کے اعتبار کا ہے۔ یعنی عشق جب ظہور میں آتا ہے تو عاشق بن کر رقص کناں ہوتا ہے اور اگر باطن کے حجاب میں نہاں تو شانِ معشوق میں محمل نشیں ہوتا ہے۔

اب میرے ذہن میں یہ جو ہر عشق بکمال کچھ ایسے سما چکا ہے کہ اس نے میرے دل کے آئینے میں ذات باری عز اسمہ کا نور روشن کر دیا ہے اور اس کی کرنیں میرے دل آئینہ سے چھن چھن کر منعکس ہوتی ہیں۔ ایسے میں میں ورطہ حیرت میں گم ہو کر سوچتا ہوں کہ کہاں، میں ذرۂ بے قدر ؟ اور کہاں یہ عنایت خروانہ؟ تو اس عالم تحیر میں میرے سامنے سے عاشق (مجنوں) اور معشوق (لیلیٰ) کا امتیازی فرق

اُٹھ جاتا ہے پھر میں خود ہی مجنون بن کر اپنے من یعنی اپنی لیلیٰ کا طواف شروع کر دیتا ہوں۔ یعنی میں خود ہی عاشق (مجنوں) اور خود ہی معشوق (لیلیٰ بن کر اپنے سامنے آ کھڑا ہوتا ہوں۔

چنانچہ مکاشفۃ القلوب کے باب عشق میں مرقوم ہے۔

''لوگوں نے مجنوں کو کہا۔ لیلیٰ مرد کہ لیلیٰ مر گئی۔

گفت لیلیٰ در قلبِ منست و لیلیٰ من خود ہستم

اس نے کہا ''لیلیٰ کیسے مر سکتی ہے؟ وہ میرے دل میں ہے۔ بلکہ میں خود لیلیٰ ہوں۔ سو سمجھیئے! اس تفصیل سے مسئلہ وحدۃ الوجود کا راز بھی یہی ہے۔

مسئلہ وحدۃ الوجود کی تحقیق مزید:

بیان مذکور سے مسئلہ وحدۃ الوجود اور سہل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ''جب انسان کو اس مقام تک رسائی نصیب ہوتی ہے۔ تب اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ہر ماسویٰ اللہ، باطل محض اور حق، صرف اللہ سبحانہٗ ہے لہٰذا اپنے سامنے کامل طور پر نام حق کے متحقق ہو جانے وہ خود سے بھی گزر جاتا ہے اور وارفتگی کے اس عالم میں اس سے ''انا العبد'' کی بجائے ''انا الحق'' کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں''۔

جس کی بہت بڑی شہادت شاہ منصور حلاج علیہ الرحمہ کا واقعہ ہے۔ مزید برآں قرآن مجید کی آیت ذیل میں بھی اس کی مزید ہے۔ ارشاد گرامی ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ط ہٹا دو حق آ گیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل کو مٹنا ہی ہے۔امام قشیری علی الرحمہ نے اس آیت کی تفسیر کے ضمن بیان کیا ہے۔ 18

''حق وہ ہے جو صرف اللہ کے لئے ہو اور باطل جو اس کے غیر کے لئے ہو''۔ نیز یہ کہ ارباب تاویل کو بھی تسلیم ہے۔

''ازلی، ابدی، وجود ثابت اور واجب الوجود، صرف حق تعالیٰ جل جلالہ ہی ہے اور وجود بشری، باطل، امکانی اور قابل فناء و زوال ہے۔ شاہ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں مذکور ہے۔ ''فقط وجودِ حقانی ہی ہے جو ہر ظہور میں جلوہ نما ہے اور اس کے سوا ہر وجودِ ممکن، موہوم، اس کی تلاش و جستجو میں تھکا، ماندہ اور سرگردان عمل ہے۔ فللّٰہ در القائل

ہمہ ہر چہ ہستند ازاں کمتراند
کہ با ہستیش، نام ہستی برید

یعنی بظاہر جو کچھ موجود ہے۔ اس سے ہیچ و کمتر ہے۔ بلکہ ان کی ظاہری موجودگی بھی اس ہستی کی مرہون منت ہے۔

چوں سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

کیونکہ عزت و عظمت کا سردار سلطان اعظم جب اپنا علم سر بلند فرمائے گا تو کائنات سماوی و ارضی کا ہر فرد اپنا منہ جیب عدم یعنی فنا کے گریبان

میں ڈال لے گا۔

تمہید شعر ۸:

تحقیق مذکور سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ وجود ماسوی اللہ اپنی اصل میں باطل محض اور وجود حقیقی صرف وجودِ حق تعالیٰ ہے۔ اور جو وجود ہم اپنی جانب نسبت کرتے ہیں۔ فی الحقیقت اسی وجودِ حقیقی کے آئینہ سے انعکاس ہے جو ہمارے اثبات کی صورت میں اس آئینہ سے منعکس ہے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ صورت معکوسہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ جمیع حقائق کی جامع ہو۔ لہٰذا وہ ظاہری اور مخفی صفات جو حق تعالیٰ نے عاشق و معشوق کے تعین سے اپنی ذات میں متعین فرمائی۔ وہ ہم میں بھی ظہور پائیں۔ کیونکہ اس کا فرمان ہے۔

لِاَنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت (جیسی اس کے لائق ہے) پر پیدا کیا۔ اب گرامی اس مسئلے کو اپنے آئندہ شعر میں ایک نئے انداز میں بیان کرتا ہے۔ نیز نفی اثبات ماسبق ذکرہ کے اتحاد کی مزید توضیح کی جانب رجوع کرتے ہوئے اس پر ایک اور دلیل قائم کرتا ہے۔

آٹھواں شعر:

ظاہر و پنہان من، آینہ ناز و نیاز
دست در آغوشِ و رحمت پیکر جوزائے مَن

مفہوم:

یعنی میرا ظاہر و باطن حق تعالیٰ کے ناز و نیاز کا آئینہ ہے اور میرا یہ پیکر (خاکی) جو کہ ظاہر و باطن سے مرکب ہے۔ اسی کے آغوشِ رحمت کا دامن گیر ہے۔

اور اس میں حدیث قدسی مذکور کے مطابق ظہور و بطون کی یکجائی موجود ہے۔ جیسا کہ حق جل شانہٗ نے عاشق و معشوق کے تعین سے ظہور کیا حالانکہ وہ عین واحد ہے۔

اس گفتۂ گرامی نے اس شبہ کا قلع قمع کر دیا جو تمثیل مجنوں اور لیلیٰ پر وارد ہوا کہ مجنوں و لیلیٰ تو دو علیحدہ شخصیات میں باہم متحد کیسے ہو گئے۔ یعنی مجنوں اور لیلیٰ میں وجودی مغائرت ہے لیکن شاعر اپنے اندر دونوں کی یکجائی کا قول اس لئے کرتا ہے کہ اس کا ظاہر آئینہ نیاز ہے جو عاشقی کی دلیل ہے۔ اس لحاظ سے مجنوں ٹھہرا اور اس کا باطن معشوق کے ناز کا مسکن ہے جو کہ لیلیٰ کا مظہر ہے، اس لئے بنظر باطن اپنے آپ کو لیلیٰ قرار دیتا ہے۔ اور یہ معنی محض وہم اور اندیشہ نہیں بلکہ صوفیاء کرام کے نزدیک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ چنانچہ کیا خوب صاحب حال نے

مرحبا ، احمد بے میم، محمد لقبی

عین ربی بحقیقت و مجازاً عربی

خوش آمدید اے احمد، بلا میم "محمد" لقب سے ہو کر جلوۂ شہود فرمانے والے آپ حقیقت میں تو میرے رب کا عین ہو البتہ لباس مجاز میں

عربی بن کر مبعوث ہوئے ہو۔

اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ کا کہا تو اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ بتامل کامل ملاحظہ کریں۔

بیدلؔ آئینہ معشوق نما دربرتست

ایں نیازے کہ تو داری، نشوو نازچرا

بیدلؔ ! آئینہ معشوق چونکہ تیرے پاس ہے اس لئے مقام عشق میں تیری یہ نیاز مندیاں، مقام ناز پر فائز کیونکر نہ ہوں۔

کیا یہ مقام حیرت و استعجاب نہیں؟ کہ ''ناز و نیاز'' جو باہم مختلف ہیں اور عین واحد میں ثابت ہو رہے ہیں کہ نفی عین اثبات ہے اور اثبات عین نفی ہے۔

اور اشعار متذکرہ بالا کا جو مضمون بتحقیق مذکور ہوا ہے۔ اس پر قرآن بھی شاہد ہے۔ فرمان حق تعالیٰ ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَہٗ ثُمَّ تَمْتَرُوْنَ٥ وَهُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ٥

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں گارے (عدم) سے پیدا کیا۔ پھر فیصلہ فرما دیا ایک متعین مدت کا۔ اور وہ مدت اس کے میں مقرر ہی ہے (اور تمہیں معدوم کر دیا جائیگا تعجب ہے) تم پھر بھی (اس کی وحدت وقوت میں) شک کرتے ہو ور وہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہر شے کو اور

تمہارے ظاہر اور باطن بھی جانتا ہے اور اسے بھی خوب جانتا جو کچھ تم کرتے ہو۔

آیہ اوّل سے واضح ہوا کہ تم عدم سے وجود میں لائے گئے ہو اور بعد مدت مقررہ تم اس وجود سے پھر عدم میں چلے جاؤ گے لہٰذا دو عدموں کے درمیان پر عارضی وجود جسے تم اپنی جانب نسبت کرتے ہو۔ یہ محض ایک وہم ہے اور وجود حقیقی صرف وہ ہے جو منسوب بحق تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اس کے واحد الوجود اور واجب الوجود ہونے میں شک و اثبات کی گنجائش کہاں؟

سو یہی معنی ہے ''وحدۃ الوجود'' کا جس کی کامل تفسیر آیت مذکورہ بالا کا دوسرا جز بیان فرما رہا ہے۔ ارشاد ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جو موجود ہے آسمانوں اور زمین میں وہی جانتا ہے۔ تمہارے پوشیدہ اور ظاہر کو اور وہی جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔

صاحب تفسیر حسینی، فتوحات مکیہ سے نقل کرتے ہیں کہ ''سِرَّکُمْ'' انسان کا باطن اور ''جَھْرُکُمْ'' اس کا ظاہر مراد ہے۔

چنانچہ صاحب تفسیر حسینی ان نصوص قرآنیہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''انسان ایک ایسا آئینہ ہے جس کے دو رُخ ہیں۔ جس کے ایک رُخ سے خصائص ربوبیت نمایاں ہوتے ہیں اور اس کے دوسرے رُخ سے اس کے نقائص عبودیت ظاہر ہوتے ہیں''۔

لہٰذا جب انسان خود سے خصائص ربوبیت ظہور پذیر ہوتے

دیکھتا ہے تو وہ اپنے ہر بلندی سے بلند تر سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب اس کی نظر اپنے نقائص عبودیت پر جاتی ہے تو تمام کائنات سے اپنے آپ کو بے قدر و کمتر تصور کرنے لگ جاتا ہے۔

تمہید شعر نمبر۹:

متذکرہ معارف و حقائق پر کامل دسترس فناء کامل اور بیخودی سے حاصل ہوتی ہے اس لئے گرامی اب ان شرائط عظیمہ کو ایک فیصلہ کن انداز میں ذکر کرتا ہے جو فناء و بیخودی کی بنیاد ہیں اور ساتھ میں یہ بھی واضح طور کہتا ہے کہ بیخودی و فناء کی یہ اسے (بلفضلہٖ) میسر ہے۔

نانواں شعر:

حلقۂ زنجیر مَن، آویزۂ گوشِ جنوں
داستانِ بیخودی، افسانۂ سودائے مَن

مفہوم شعر:

علوم و معارف اور حقائق باطنیہ کا انکشاف چونکہ میری بیخودی و فنا پر موقوف ہے اس لئے وہی علوم و معارف اور حقائق باطنیہ کو میں نے بطور حلقہ (زیور) بنا کر اپنے گوش جنوں کی زینت بنا لیا ہے تا کہ وہ میری غلامی (شانِ بندگی) کی دلیل بن کر یہ ظاہر کر سکیں کہ داستان بیخودی کیا ہے؟ تو میرے ہی عشق و جنوں کا افسانہ ہے اور یہ دونوں ایک ہی چیز ہے۔ سو یہ واضح ہو کہ ''سوائے من'' کی یہ داستان طویل کرشمہ ہے اس بیخودی و بیساختگی کا جو بوقت وحی (اوّل پیغمبر ذو جہاں

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر طاری ہوئی تھی۔

تشریح:

قرآن مجید میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور جو ہماری راہ میں (ہمیں پانے کیلئے) کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کی راہنمائی کرتے ہیں۔ ارشادِ حق تعالیٰ یہ خبر دیتا ہے کہ حقائق و معارف کے انکشاف اور انہیں قبول کرنے کی استعداد کے لئے ریاضت نفس، مجاہد اوردنیا سے مکمل کنارہ کشی ضروری ہے بلکہ اس آیت سے یہ بھی عیاں ہے کہ کشف حقائق کا ذوق سلیم تو ''جاہدہ'' کے تبع ہے۔ خلاصہ یہ کہ اطرافِ دنیا، مجاہدہ و ریاضت بیخودی اور فنا کی شرط اور سرمستی کی یہ کیفیت، حقائق باطنیہ اور معارف پر اطلاع وانکشاف کا مضبوط ذریعہ ہیں تو شاعر ممدوح کا کہنا ہے کہ میں نے انہی چیزوں کو اپنے گوش جنوں کا زیور بنا لیا تاکہ ان کی موجودگی میں میری دیوانگی کی یہ کیفیت اورافسانہ عشق میری طرف سے میری داستان بے خودی کی دلیل بن جائے۔

تمہید شعر نمبر۱۰:

چونکہ معرفت و معاہدہ کا یہ طریق دقیق، قرآن کریم میں اللہ سبحانہ کے حکم و ارشاد ''وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ'' کہ تم اس کی جانب وسیلہ تلاش کرو۔ کے مطابق اہل بصیرت سے استعداد و استعانت ☆سے آسان وسہل ہو جاتا ہے۔

اس لئے اب صوفیاء ان کے ساتھ ربط اور تعلق شرط قرار دیتے ہیں گرامیؔ بھی اپنے آئندہ شعر میں اپنے اس رہبر و راہنما سے وابستگی کو بطور جزاء سے بیان کرتا ہے جن کی برکت سے اس کے لئے آسانیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ کہتا ہے۔

دسواں شعر:

مَن بدامانِ معین الدین حسنؔ دستے زدم
خواجہ من۔ سیّد مَنْ خضر مَن ، مولائے مَن ☆

مفہوم و تشریح:

لہٰذا میں حضرت خواجہ خواجگان سیّدنا معین الدین حسن (سنجری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے دامن رحمت سے وابستہ ہوں اور انکشاف حقائق اور ادراک معرفت کے پر خطرہ راستوں میں آپ ہی میرے سیّد و سردار، رہبر وراہنما اور رفیق سفر ہیں۔

اور یہ کہ آپ سے نسبت و وابستگی مجھے آپ سے کمال محبت اور حسن عقیدت کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ کیونکہ آپ قرآن مجید میں اللہ سبحانہٗ کے ارشاد ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ'' کی روشنی میں حق سبحانہ کے انعام یافتہ علیہ بندوؤں کے سرخیل ہیں جن کی راہ پر چلنے کی تاکید ہے اس لئے آپ کی حیات رغبت اور گرمجوشی کی وجہ سے میرا طبعی میلان اور فکر عشق کی حد تک سرشار ہو چکا ہے۔ گرامی اس کو مزید نکھار کے بیان کرتے ہیں۔

گیارھواں شعر:

گرمجوشی ہائے عشق خواجہ بندہ نواز
جلوہ ریز آمد، درآغوشِ دل، دانائے من

یعنی خواجہ،بندہ نواز کے عشق اور آپ کے اس روحانی وقلبی تعلق جو ان کو اپنے خالق حقیقی اورمحبوب اکبر سے ہے، دونوں اوصاف نے میرے دل دانا یعنی قلب سلیم اورفکر دانش میں حقائق و معارف کے بند دروازے کھول دیئے ہیں۔ کہتا ہے۔

از چاشنے سوختنم بے خبری بود
برق نگہ، ہوش ربا خبر بے داد

یعنی میں سوزِعشق کی لذت سے بالکل آشنانہ تھا۔ مگر اس کی برق بارنگاہ اور ادائے دلبری نے مجھے اس کی آ گاہی کی۔

از رفتن آں شوخ ازیں راہ گرامی
گل بازی نقش کف پائے خبرم داد

گرامی! اس شوخ ادا کے اس راہ (کوچہ غربیاں) سے گزرنے کی اطلاع مجھے اس کے کف پا کے نقوش نے دی ہے۔

ابھی اس راہ سے گذرا ہے کوئی
بتاتی ہے تجلی نقش پا کی

لگے ہاتھوں، گرامی کی یہی شعلہ بیانی اور آتش نوائی ان کے دوسرے چند اشعار میں ملاحظہ کریں۔

مَن ندانم در سم سودائے کیست؟
من ندانم خانہ دل جائے کیست؟

مجھ وارفتہ کو کیا معلوم؟ کہ کس کا عشق ہے جو میرے دل و دماغ میں سما چکا ہے اور کون ہے وہ؟ جو میرے دل میں جلوہ گر ہو گیا ہے؟

واہ! چہ سود انیست سودائے کسے
واہ! چہ غوغائے است غوغائے کسے

لیکن، واہ! قربان میں اس شورشِ عشق کی لذت کے، کیا کمال ہے، یہ کسی کا عشق؟ میں صدقے اس مستی پر، کیسی عجب ہے؟

داشت سودائی کسے جان بلال
جیب موسیٰ شد گریبان بلال

اب پتہ چلا کہ جان حضرت سیّدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کس (جن کا علم حضور غریب نواز کی برکت مجھے بھی ہو چکا ہے) کے عشق میں سرشار تھی کہ جس کی وجہ سے آپ کا چاک گریباں بھی، جیبِ موسیٰ علیہ السلام کی طرح جلوہ گاہ نور بن گیا۔

بود سودائے محمد درسرش
چشم موسیٰ بود آں چشم ترش

(پھر میرے ذوق تخیل نے میری فکر پر یوں دستک دی اور کہا) کہ حضرت سیّدنا بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل معطر شام میں جان کائنات حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا جلوہ عشق سمایا ہوا

تھا کہ ان کی چشمان تر میں حضرت سیّدنا موسیٰ علیہ السلام کی چشم بینا کا نور جھلکنے لگا۔

نتیجہ فکر:

تشریحات بار سے یہ واضح ہوا تاوقتیکہ دل بالکلیہ ترک دنیااور ماجدہ ور یافت کے ذریعے حصول فیض کے لئے مستعد نہ ہو اور اس کے نکتہ نظر میں اس ذاتِ واحد جو تمام اشیاء عالم (جملہ اعیانِ ثابتہ) کی مختلف صورتوں اور رنگینیوں میں جلوہ نما ہے کی معرفت مقصود بالذات نہ ہے۔ تب تک حضرت خواجہ خواجگان غریب نواز کے چہرۂ حق نما کی تابانیوں اور ان کے تعلق باللہ کے فیضان سے مستفیض نہ ،ہو سکے گا۔

لہٰذا اوّلاً دل خود صفت دانائی سے خوب مزین ہو کر برائے اکتساب فیض تیار ہو تا کہ بعد ازاں وہ افاضہ خلق کا قرض بھی نبھا سکے۔

فیض یابی کے ارکان اربعہ:

گرامیؔ نے اپنے ہر دو اشعار متذکرہ بالا میں حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اپنے تعلق خاطر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان ارکان اربعہ کی بھی خوب وضاحت فرما دی ہے جن کے بغیر حصول فیض ممکن ہے اور نہ ہی فیض رسانی ممکن ہے۔ اور وہ ارکان یہ ہیں۔

1۔ مستفیض ،فیض حاصل کرنے والا۔

2۔ مستفاض عنہ، جن سے فیض حاصل کیا جائے۔

3۔ مستفاض، فیضان۔

4۔ مستفاض بہ، حصول فیض کا ذریعہ

لہٰذا ان اصول اربعہ کی روشنی میں لازم ہے کہ مستفیض (فیض حاصل کرنے والا) حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دامن رحمت سے کامل وابستہ ہو کر آپ کی روح پُرفتوح اور ذات اقدس جو کہ ''مستفاض عنہ'' (جن سے فیض حاصل کرتا ہے) کے درجہ علیہ پر فائز ہو اور پھر برائے قبول فیض مکمل طور پر مستعد ہو اور پھر ''مستفاض بہ'' (ذریعہ فیضان) جو کہ پر نور اور سرور بخش آپ کی کیفیات باطنیہ اور تجلیات قلبیہ ہیں، سے عشق کا کامل ربط پیدا کرے تاآنکہ اُسے ''مستفاض (فیض) نصیب ہوا اور خواجہ غریب غریب نوازؒ کی نظرِ کرم جوشی سے اس کی جانب متوجہ ہو۔

تمہید شعر ۱۲:

گرامی نے اوّل حقائق و معارف کا ذکر کیا۔

ثانیاً اس راہ سلوک میں اور کشف معارف و حقائق تک رسائی کے کامل ذریعہ اہل اللہ کی اتباع اور صالحین سے تعلق قلبی کو بیان کیا جو کہ اہل طریقت شرط ہے۔ اب آیت کریمہ مذکورہ ذیل سے استدلال کرتے ہوئی اس ''جنت'' کا ذکر چھڑا جو کہ صالحین کو بطور ورثہ ملی۔ چنانچہ ارشاد حق تعالیٰ ہے۔ اس کا تذکرہ بھی نہ ہوا ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُوْدُوْا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّ

اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ O یعنی انہوں نے کہا (اقرار کیا) کہ تمام حمد ہے اس اللہ کو جس نے ہمیں اس کی (راہ حق) کی ہدایت دی اور ہم کبھی ہدایت نہ پاتے اگر اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی نہ فرماتا۔ بے شک ہمارے پروردگار کے تمام رسول حق لے کر آئے۔ سو ان کو ندا کی گئی کہ یہی ہے وہ جنت کہ جس کے تم وارث بنائے گئے ہو یہ بدلہ ہے ان اعمال کا تم کرتے رہے۔

نیز یہ بتایا جا رہا ہے کہ ظہور تجلیات اور حقائق کا شہود و انکشاف جو کہ مظاہر سے اعراض اور جانب معنی توجہ کا سبب ہیں لیکن اب میں بطور جزا اس مستور حقیقت کو واضح بیان کرتا ہوں۔

بارھواں شعر:

مَن بہشتِ معینم با حور و غلما تم چہ کار
نظم و نثرِ من بود غلمانِ مِن حورائے من ☆

مفہوم:

یعنی اللہ کے فضل اور حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نظر عنایت سے درحقیقت حضور غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی جنت جو آپ کو بطور صدقہ کے ملی وہ میں ہی ہوں اور حور و غلماں جو کہ جنت کا جزو لازم اور خاصہ ہیں وہ میری نظم و نثر ہے۔ لہٰذا جب جنت میں خود ہوں، حور و غلماں میری تو مجھے جنت معروضے اور اس کے حور و غلماں سے سرو کار کیا؟

تشریح:

معلوم ہونا چاہئے کہ ''جنت اور جہنم'' یہ محض دو مقامات ہیں جو قرآن میں اور احادیث میں مذکور ہیں البتہ جنت میں موجود حور و غلماں وہ خود تمہارے اعمال حسنہ ہیں خو بصورت حور و غلمان اور نعیم جنت تمہارے سامنے ہوں گے۔

یوں جہنم بھی ایک وادی ہے جس میں مار واژدھا، آگ یا عذاب کی گوناں ، گوں صورتیں وہ تمہارے اعمال ہوں گے۔ لہٰذا گفتۂ گرامی کا معنیٰ بالکل واضح ہے کہ

''جنت یا جہنم یہ بندہ خود ہے'' تب ہی تو کسی نے کہا ہے۔

نیکِ تو روضہ شود زنعیم
بد تو حفرۃ شود جحیم

یعنی (اے بندے) تیرے عمال ہی تیرے لئے جنت نعیم کا باغیچہ اور تیری بدیاں ہی تیرے لئے جہنم کا گڑھا ہیں۔

اس لئے (شاعر ممدوح) کو حضور غریب نواز کی نسبت اور تعلق خاطر پہ اس قدر اعتماد و ناز ہے کہ وہ فیضان حضرت خواجہ کی برکت سے (تحدیث نعمت) کے خود کو جنت سے تعبیر کرتا ہے اور اپنی نظم ونثر کو حور و غلمان اور نعیمِ جنت شمار کرتا ہے۔

تمہید شعر نمبر ۱۳:

یہاں ایک وہم پیدا ہوتا ہے کہ حور و غلماں جو جنت کا لازمی

حصہ اور اس کی نعمتوں میں سے ہیں تو شاعر کا ان سے صرف نظر کرنا اور در خود اعتناء نہ جاننا باعث تعجب ہے۔

لیکن فی الحقیقت یہ ایک وہم ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں کیونکہ گرامی کا حور و غلماں سے بے نیازی ظاہر کرنا صرف اس لئے ہے کہ وہ خود کو محض ظاہراً اہل جنت سے نہیں شمار کرتے بلکہ ان کا مقصود ہے کہ بفضل اللہ، اعلی علیین اور اولوالباب کی حقیقتوں سے شناسا اہل جنت میں سے ہیں کیونکہ صرف ظاہر داری یا اہل ظواہر کی مدحت تو ایک بے فائدہ عمل ہے۔

جبکہ .لی علیین کی حقیقتوں سے آگاہ اصحاب'اولو'باب دنیا و آخرت اور جنت و دوزخ کی آسائشوں یا سختیوں سے ایسے بے نیاز ہو چکے ہوتے ہیں کہ ان کے دلوں کی وسیع مملکت میں سوائے حق تعالیٰ کی سلطانی اور رضا کے کسی اور شئی کے لئے جگہ ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے شاعر ممدوح کہتا ہے۔

تیرہواں شعر:

بادشاہم، میکنم بر سَند ' دلہانشت
کسوتِ خاکسر من، اَطلس و دیبائے مَن

مفہوم:

ہاں ، میں (اپنے فقر میں) بادشاہ ہوں اور دلوں کی مسند پر رونق افروز ہوں۔ اور حقاء امکانی و وجوبی کا جامع میرا یہ وجود خاکی

میرے اطلس و دیبا کا درجہ رکھتا ہے۔

فائدہ نافعہ:

شعر میں لفظ ''دل'' واحد کی بجائے صیغۂ جمع ''دلہا'' کرنا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔پس جاننا چاہیے، انسان جب اپنے نفس (ذات) کو تمام تعینات سے جدا کر کے مکمل طور پر نفس کلیہ (وجود حق) میں فنا کر دیتا ہے تو پھر یہ بھی اس کے ہاتھ کلیہ کے ساتھ باقی ہو کر تمام نفوس میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے کہ جمیع نفوس اس کی سلطنت و بادشاہت قرار پاتے ہیں۔

اس لئے گرامی نے کہا۔ ''بادشاہم، میکنم بر مَسندِ دلہا نشت''

تمہید شعر نمبر ۱۴:

نظم کے مطلع کی شرح میں بیان ہو چکا کہ حیاتِ دنیا قابل مذمت و ملامت اس لئے ہوئی کہ اس میں ارتکاب معاصی نے حیاتِ اخروی کو بگاڑ دیا۔ شاعر محترم ایک بار پھر اس پر حسرت و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے حیاتِ دنیا کی برائی کی اصل وجہ کو مزید بیان کرتا ہے۔

چودھواں شعر:

حسرت اندر حسرتم، امروز و فردائم پُرس
مے تراود، خونِ امروز، از رگِ فردائے مَن

مفہوم:

افسوس! بے حد افسوس، میرے آج (حیاتِ دنیا) کی خرابیوں

اور بداعمالیوں نے اپنی بربادی کے ساتھ میرے فردا (حیاتِ آخرت) کی کیفیت و حالت کو بھی ناقابل استفسار بنا دیا ہے۔ بلکہ ان کی صورت (خرابی) اتنی واضح ہوگئی ہے کہ خونِ امروز (حیات دنیا کی بدعملی) رگ فردا (آخرت کی ہولناکی) سے ٹپک رہا ہے۔

تشریح:

چونکہ آخرت، حیاتِ دنیا کی علت غائیہ ہے اور علت اپنے معلول کا عین بلکہ معناً معلول کے وجود سے مقدم بھی ہوتی ہے۔

چنانچہ بمصداق ''خُلِقَ الْاِنْسَانُ الْاٰخِرَةِ ''۔ ''انسان کو آخرت کے لئے ہی پیدا کیا گیا ہے''۔ لہٰذا آخرت کا حیاتِ دنیا کی علت غائیہ ہوتا، اس کا عین ہونا اور معناً اس کے وجود سے مقدم ہونا ثابت کرتا ہے کہ حیات دنیا، آخرت سے برآمد ہوگی۔ اس لئے آخرت کی خرابی سے عیاں ہوتا ہے کہ اس سے برآمد میری حیات دنیا کس قدر خراب و خستہ حال ہوئی ہے۔ اسی کو گرامی نے ''مے تراود، خونِ امروز، از رگ فردائے مَن'' کے الفاظ سے بیان کیا ہے کہ ''رگ فردا'' سے ''مرد و زن کے خون ٹپکنے کا مطلب ہے کہ فردا (آخرت) کی تباہ حالی بتاتی ہے کہ امروز (حیات دنیا) بھی صحیح بسر نہیں ہوا۔

نظریہ فلاسفہ پر تحقیق:

اس مسئلے کی تحقیق مزید ہم فلاسفر کے مذہب کے مطابق بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا کہنا ہے۔ ''جب کسی شے کی عدمیت، کسی

دوسرے شے کے وجود سے منسلک تو اس وقت اس شے (اوّل) کی دو جہتیں ہوتی ہیں"۔

۱۔ جہتِ وجود ۲۔ جہت عدم

اب جب شے (اوّل) کو صفت وجود سے متصف بفند کیا جائے گا تو اس وقت اس کا تقدم (شے آخر) یعنی اس کے وجود حادث کے اعتبار سے ہوگا۔ اور وجوود حادث ہرحال ایک دوسری شے ہے۔ لہٰذا شے اوّل کا تقدم با عتبارنفس ذات متقدم نہیں مانا جائے گا۔ کیونکہ خود اس کی ذات کا متقدم ہونادوسری شے کی ذات کے تاخر سے جڑا ہوا ہے۔ اب جب شے (اوّل) کی "قبلیت" شی آخر کے "عدم" کے بغیر ثابت کی جا سکے۔ چنانچہ جس طرح اس کا تقدم دوسری شے کے تاخر کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح شے اوّل کی اوّل بھی شے کی عدمیت کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی۔

مثال: مثلاً باپ کی ابویت بیٹے کی ابنیت سے اس طرح قیاس کی جاتی ہے کہ باپ کا جوہر جب بیٹے کے جوہر سے ملتا ہوتو جو ہر پسر کے تاخر سے جوہر بدر کا تقدم متعین ہوا لیکن قبلیت پدر فقط باپ کے جوہر کی جوہر پسر سے مقارنت مستحق نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی قبلیت تو بیٹے کی عدمیت سے تسلیم کی جائے گی۔

چنانچہ صدر نشینانِ میر خاصاں حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمہ نے بھی اس مسئلہ کو "بحث زمان" کے ضمن میں اس طرح بیان کیا ہے

اور کہا ہے کہ یہی ''مذہب'' الٰہیین کے مسلک کے قریب تر ہے۔

نتیجہ بحث:

پس ''عدم امروز'' جو کہ وجود فردا کے ساتھ ایک خاص معیت رکھتا ہے، کو اسی پر قیاس کرتے ہوئے سمجھنا چاہئے کہ اس (عدم امروز) کی بھی دو جہتیں ہیں۔

مثلاً جب وجودِ امروز کو ملحوظ رکھیں گے تو ''فردا'' پر اس کا تقدم وجودِ فردا سے نہیں بلکہ عدمِ فردا سے ہوگا۔ ورنہ وجود فردا تو خود سبب ہے وجود امروز کے قائم رہنے کا۔ اب جب فردا کو موجود تصور کریں گے تو امروز بھی وجودِ فردا میں مستحقق ہوگا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ جیسے امروز کو رگ فردا سے نکلنا مانتے ہیں اسی قیاس سے حیات دنیا کو حیات اخروی میں ثابت کیا جائے گا۔البتہ امروز و فردا میں جاری یہ قیاس مجازی ہے حقیقی نہیں اور کتب فلاسفر میں بھی ہے بطور مجاز ہی ذکر کیا گیا ہے اور با اعتبار زمانیات، شے کی اوّل و آخر ہونے میں اس کا چنداں اعتبار نہیں ہے۔ بلکہ قبلیت واحدیت کے تعین میں جسے چیز کو بالذات پیش نظر رکھا جاتا ہے وہ خود ''زمانہ'' ہے اس وجہ سے (با عتبار زمانہ) خبرو سابق، لاحق نہیں ہوتی اور لاحق، کبھی سابق نہیں ہوسکتی۔

لہٰذا اس قیاس مجازی کو امروز و فردا کی بحث میں جاری کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ امروز کو وجودِ فردا میں ثابت کرکے مقصود شاعر کو خوب واضح کیا جا سکے۔

تمہید شعر نمبر ۱۵:

شاعر عدیم النظیر اپنے آئندہ شعر میں اسے مزید واضح کرتا ہے کہ امروز فردا دو زمانے ہیں لیکن ہر ایک کا وجود دوسرے میں ثابت ہے (اسے اس نے مثال سے بیان کیا کہ میں یعنی گرامیؔ اور عرفیؔ باوجود بعد زمانی کے طبع ایک جیسی رکھتے ہیں) چنانچہ کہتا ہے۔

پندرہواں شعر:

طبع عرفی و گرامی خوردہ ازیک دایہ شیر
گفتہ عرفیت اینک حجت دعوائے مَن

مفہوم:

عرفی جو کہ ایک نامور سخنور تھا، لیکن با عتبار زمانہ وہ گرامی سے پہلے ہوا لیکن گرامی زمانی تقدم و تاخر کے باوجود سخنوری میں خود کو عرفی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ایسے کہ دونوں نے گویا ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے۔

تشریح:

یعنی باعتبار زمانہ عرفی کہ دور اوّل کا ایک قد آور شاعر تھا اور گرامی اس کے بعد دور کا۔ مطلب کہ دونوں الگ الگ شخصیات اور زمانہ بھی دونوں کا علیحدہ علیحدہ، لیکن گرامی کو اپنی سخنوری و شعر گوئی اور نازک خیالی پر اس قدر ناز اور فخر ہے کہ وہ خود کو اپنے دور کا عرفیؔ قرار دیتا ہے۔اور کہتا ہے کہ گرامیؔ اور عرفیؔ کی شاعرانہ طبیعت اور فکری اوج اس قدر قریب تر ہے کہ گویا دونوں نے ایک ہی ماں کا دودھ پیا ہے۔

چنانچہ گرامی اپنے اس دعویٰ پر بطور دلیل عرفی کا ہی ایک شعر تسلیما پیش کرتا ہے۔ چنانچہ عرفی نے کہا تھا۔

دود مانِ عشق را از من گرامی تر نزاد
جوہر من کرد روشن، گوہر آبائے مَن

گفتہ عرفی کا مطلب ہے کہ

''میرے خاندان عشق و محبت میں (اگرچہ بہت سارے اصحاب علم و فضل ہوئے) لیکن مجھ سے بڑا سخنور اور گرامی، یعنی معزز آدمی پیدا نہیں لہٰذا میرے کمال سخنوری نے میرے آباؤ و اجداد کے لعل و گوہر (علم و فضل) کو روشن و تابدار کر دیا''۔

سو اس گفتہ عرفی) سے تلمیحاً اخذ کرتے ہوئے اب گرامی کا یہ کہنا ہے کہ۔ طبع عرفی و گرامی خور وہ از یک دایہ شیر''

یعنی مانا کہ عرفی کے عشق حقیقی سر شار خاندان علم و فضل میں عرفی سے بڑا کوئی قادر الکلام شاعر، عالم، فاضل اور ''گرامی، تر (معزز ترین) پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اس کے بعد ایک ''گرامی نام☆'' صاحب کلام تو پیدا ہوا ہے جس کا کمال سخن عرفی کے کمال سخن سے کمال مطابقت رکھتا ہے چونکہ بعد زمانہ کے باوجود جیسے دونوں (عرفی و گرامی) نے ایک ماں کا دودھ پیا ہے اور طبع شاعری میں تاخر زمانی کے باوجود گرامی، عرفی متقدم سے متحد ہے۔ تو جیسے عرفی کے کمال سخن نے اس کے آباؤ و اجداد کے نام کو روشن کر دیا تھا ایسے ہی میرے (گرامی) کے شاعرانہ جواہر

پاروں نے میرے بزرگوں کے گوہر مراد کو جلا بخشی ہے۔

انتباہ:

البتہ یہاں ایک وہم سا پیدا ہو سکتا ہے وہ یہ کہ وہ عرفی کہلائے اور میں گرامی کے تخلص سے پکارا گیا۔ تو ان دونوں الفاظ "تخلص" میں بہ نسبت "عرفی" کے تخلص گرامی میں ایک برتری کا معنی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔

وہ اگر بجانب عرف نسبت اختیار کرکے "عرفی" کہلائے ہیں تو صرف شناخت کے لئے ہے جیسا کہ قرآن میں وارد ہے۔

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۔ یعنی ہم نے تمہیں خاندانوں اور قبائل میں تقسیم کیا تو یہ صرف اس لئے کہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جاؤ۔ لہٰذا اس آیت قرآنیہ کے تناظر میں ان کا "عرفی" تخلص اختیار کیا اور مجھے "گرامی" سے یاد کیا جانا یہ صرف پہچان کے لئے ہے ۔ رہا یہ کہ معنی کے اعتبار سے لفظ گرامی بہرحال عزت و بزرگی پر وال ہے اور یہ میرا تخلص ہے۔ تو "الفضل للمتمقدم" کی تسلیم شدہ حقیقت کے مقابلے میں اس کی حیثیت ایک وہم سے زیادہ نہیں اور حق یہی ہے کہ بزرگی و کرامت ہمیشہ (حق پر قائم) متقدمین کے لئے ہوتی ہے۔ لہٰذا میرا لقب گرامی سے ملقب ہونا بھی ایسی ہی بزرگی اور کرامت کا ترجمان ہے جو اکابرین و متقدمین کی برکت سے نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے میں خود برملا عرض کناں ہوں۔

سولہواں شعر

یا معین ، مے ریزد، از ہرموئے درد آویزمن

یا معین، میخوشد از ہرموجہ دریائے مَن☆

مفہوم:

(یہاں شاعر ممدوح نے کمال مہارت سے حضرت خواجہ کے اسم گرامی ''معین'' سے یا معین بول کر بہتا چشمہ مراد لیا ہے اور کہا ہے اے چشمہ فیض و کرم! دردِ الفت سے معمور میرے روئیں روئیں سے تیرے فیضان کا چشمہ جاری رہے اور میرے دریائے (نظم ونثر) کی ہر موج سے تیری بحرکرم کے سوتے پھوٹتے رہیں۔

تشریح:

حضرت خواجہ خواجگان سیّدنا معین الدین حسن اجمیری رضی اللہ تعالیٰ علیہ چونکہ حضرت سیّدنا مولانا خاتم الانبیاء محسن کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جو کہ جمیع الانبیاء و مرسلین علیہم السلام سے گرامی تر اور اوّل الخلق ہیں، کے مظہر اتم اور پرتو خاص ہیں اس لئے شاعر ممدوح حضرت خواجہ غریب نواز کی عالیجناب میں ملتجی ہوئے اور عرض کی کہ۔

اے چشمۂ فیض، معین الدین (خدا کرے کہ) درد و محبت سے لبریز میرے ہر برہان سے تیری محبت و اُلفت کے قطرات بارانِ رحمت کی طرح برستے رہیں اور اے میرے غریب نواز! میرے دریائے اُلفت و محبت اور بحرِسخن گوئی کی ہرلہر سے آپ کا ہی جوشِ عشق موجزن رہے۔

چنانچہ عارف رومی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے انداز میں اس مضمون کو کیا خوب بیان کیا ہے۔ فرمایا۔

مصطفیٰ زیں گفت کہ آدم وانبیاء
خلف من باشند در زیر لوا

اسی لئے مصطفیٰ کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سیّدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیّدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء و رسل روز حشر میرے پیچھے اور میرے پرچم کے نیچے ہوں گے۔

بر ایں فرمودہ است آں ذوفنوں
رمز نحنُ الآخرون، السابقون

اس لئے اس صاحب فنون (ماہر لطائف حقانی) نے فرمایا کہ یہی راز ہے ہم آخرین کے ''سابقون'' ہونے کا یعنی کائنات میں ہم سب کے آخر میں آئے ہیں لیکن درحقیقت اوّل ہم ہی ہیں۔

گرچہ در صورتِ ز آدم زادہ ام
من بمعنیٰ جد جد افتادہ ام

یعنی صورتاً میں نے اگرچہ سیّدنا حضرت آدم علیہ السلام سے جنم لیا ہے مگر باعتبار حقیقت ''جدّ جدّ'' سب کی اصل میں ہی ہوں۔

کز برائے من بدش سجدۂ ملک
وز پئے من رفت بر ہفتم فلک

پس، تمام ملائکہ گرامی کو حکم سجدۂ (تحیۃ) میرے اکرام کے لئے ہوا تھا اور

میں ہی تھا جو ساتوں آسمان کے پَر تک کے سلسلہ کو سر کر کے آیا ہوں۔

بس زمن زائد در معنی پدر
بس زمیوہ زاد در معنی شجر

بس! یہی حقیقت ہے مجھ سے باپ کے ظہور کی اور یہی حقیقت ہے میوے سے شجر کے ظہور کی

اوّل فکر، اخر آمد در عمل
خاصہ فکر بے کاں بود و صف ازل

اس لئے فکر ہمیشہ پہلے اور عمل بعد میں وجود میں آتا ہے اور یاد رکھ کہ فکر کی یہ خصوصیت ازل سے ہی۔

تمہید شعر نمبر ۱۷:

سوگرامی بھی کہتا ہے کہ مجھے بھی حضور غریب نواز کی منقبت میں کچھ کہنے کی فکر پہلے ہوئی اور بطور عمل یہ چند اشعار بعد میں وارد ہوئے۔ اب اگر میری یہ کاوش خدمت، عالی جناب حضور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میں شرف قبولیت سے سرفراز نہ ہو تو پھر میرا "گرامی" کہلانا، چہ معنی دارد۔

اس لئے اس کی یہ قلبی خواہش اور آرزو ہے کہ اے کاش! حضرت علی، ممدوح من حضرت خواجہ خواجگان غریب نواز صرف یہ فرما دیں کہ ہاں۔ گرامی ہی ہے، جو ہمارے دربار عالی کا شاعر سخنور اور یکتائے روزگار ہے۔ تو پھر بھی کہوں کہ ہاں۔ میں "گرامی" ہوں جس

نے مدحت خواجہ نغمہ سرائی کی ہے۔ چنانچہ کہا۔

ستر ہواں شعر

مدح سر کر دم گرامی ، خواجہ فرما یدکہ ہاں
مدح سنج من گرامی، شاعر یکتائے من

تشریح و مفہوم

یعنی مدحت خواجہ غریب نواز میں گرامی اپنی نظم تو مکمل کر لی ہے۔ اے کاش! میرے خواجہ بھی ایک زبان یہ فرما دیں۔ کہ ہماری مدحت میں سخن سنج یہ گرامی ہی ہے جو ہمارے دربار عالی کا شعر یکتائے روز گار ہے۔

چنانچہ گرامی کی اس فکر پیمائی کو ''نظامی گنجوی'' نے اپنے ایک شعر میں یوں سراہا اور داد تحسین پیش کی۔

گوہر دریائے گرامیست، ایں
مخزن اسرار نظامیست ایں

یعنی گرامی کے دریائے سخن کے یہ گہرہائے گرنمایہ، مجھ نظامی گنجوی کے لئے اسرار و رموز کا خزانہ ہے۔

تمت بالخیر۔۔۔بحمد للہ ترجمہ راہ فردا اختتام پذیر ہوا

بندۂ ننگ خلقت: ابوالبرکات محمد اللہ دتہ فریدی نظامی (3 محرم الحرام 1444 ہجری صلی اللہ تعالی علی حبیبہ سیدنا محمد وعلی آلہ وصحبہ و بارک وسلم

☆☆☆

حواشی راہ فردا

استاد گرامی حضور قبلہ میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

از سند العلماء مولانا علامہ مولانا مرید احمد (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

پہلا شعر:۔

(۱) نہایت ہی افسوس! کہ ''امروز من'' نے اپنے تعین یعنی اپنی دنیوی موجودگی کو منوانے کی وجہ سے ''فردائے من'' یعنی میری آخرت کی تیاری اور اس کے ظہور کے خلاف رکاوٹ بن گیا ہے۔ نیز میرے ''فردا'' یعنی آخرت کی تیاری اور اس کے لئے کی جانے والی سعی کو یوں اپنے تصرف میں لے آیا ہے کہ ''فردائے من''، امروز زمن'' کے تعین میں محجوب و مستور ہو کر رہ گیا ہے۔

غور کریں کہ وہ اجرائے زمانہ کی وجہ سے تعین امروز کی صورت میں اگرچہ مطلق فردا کے اطلاق کو تعین امروز میں تسلیم کریں گے مگر درپردہ اطلاق فردا، اتنا کمزور ہو جائے گا کہ وہ صفتِ اطلاق پر یان سے متصف ہو کر بھی عین امروز قرار پائے گا۔ یعنی فردائے من مطلقاً ایک مخصوص تعین کے ساتھ متعین ہو کر خود بخود اہم امروز سے موسوم ہو جائے گا۔

جس سے صاف ظاہر ہے کہ ''امروز من'' یعنی میری دنیوی زندگی نے اپنی موجودگی منوا کر میری آخرت کی تیاری کو یکسر ختم کر دیا ہے۔

اس تقریر نے فردائے من یعنی فکر آخرت پر امروز من یعنی دنیوی زندگی کے تسلط و جبرا اور راہ زنی کو واضح کر دیا ہے مطلب یہ کہ مانا کہ امروز بھی اپنے تعین کی صورت میں ''فردا'' کی طرح مطلقاً ایک زمانی یعنی وقت ہی ہے۔ لیکن جب اسی کے بنانے، سنوارنے کو مقصود سمجھ لیا گیا ہے تو ''امروز'' کے اس تعین خاص نے اپنے ''مُتعَیَّن'' یعنی فردائے من پر علُوّ اور تسلط کی ایک شکل اختیار کر لی ہے۔ جس کی وجہ سے فردائے من، امروز من کے تَعَیُّنُ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔

انتباہ لطیف:

اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ہر تَــعَیُّـــنُ کے تحت ایک ''مُتعَیَّن'' (بصیغۂ مفعول) کی پوشیدگی ضروری امر ہے ورنہ بغیر اس کے ''تعین'' کا قانون عمل میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔

چنانچہ جس طرح بظاہر امروز من نے اپنے تعین سے فردائے من پر ایک گوناں غلبہ اور تسلط حاصل کر لیا ہے لیکن اگر اس کے پردۂ تعین میں سے ''مُتعَیَّن'' یعنی فردائے من کا وجود تسلیم نہ کیا جائے تو خود امروز من کا تعین بھی خطرے میں پڑ جائیگا۔ کیونکہ پردۂ تعین کوئی ''مُتعَیَّن'' ہوگا تو دوسرے کا تعین درست مانا جائے گا ورنہ نہیں۔

بنا بریں مانا جائے گا کہ اگرچہ بندہ بظاہر اپنے وجود کو ہی سب کچھ سمجھتا اور اسی کی خاطر مشاغلِ دنیا میں کھو جاتا ہے مگر مت بھولئے کہ اس ''تَـعَیُّنِ عیانی'' کے پردہ میں بھی ایک ''مُتعَیَّن'' مستور

ہے۔ ورنہ تعین عیانی کا تصور ہی بے بنیاد ہے۔اور وہ ''متعین مستور'' وجودحق تعالیٰ ہی ہے۔

چنانچہ عارف باللہ مولانا عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ العزیز نے بھی فصوص الحکم کے فصِ ''کلمہ ایوبیہ'' کی شرح میں اسی طرح ہی بیان کیا۔

بنا بریں ثابت ہوا کہ ''امروز و فردا' بھی باہم متضاد نہیں کرتیں بلکہ ایک ہی ہیں۔ البتہ اپنے اپنے تعین کی وجہ سے ایک دوسرے متفارق اور علیحدہ ہیں۔

لیکن جب تعین زمانہ کو دیکھا تو اجزائے زمانہ یعنی امروز وفردا میں بھی علیحدگی کی بجائے اتحاد ہی ہے۔ چنانچہ اہل فلسفہ کے نزدیک یہ امر متعارف ہے کہ انتقال روزے سوئے شب ایسے ہی ایک لمحہ کا دوسرے کی جانب مستقل ہوتا دفعۃً ہوتا ہے بالتدریج نہیں۔

دلیل اس کی یہ ہے کہ اجزائے زمانہ ایک دوسرے سے متصل و متحد ہوتے ہیں اور وصف اتحاد وفصل دونوں ہی ان کے درمیان مشترک ہیں لیکن صفت (لمحات) فصل یعنی امرفارق جو ان کے درمیان واقع ہے وہ لمحہ اتنا کم ہے کہ اس آن کو آن موہوم کہا جا سکتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اجزائے زمانہ میں اتصال واقعتاً موجود لیکن امر فارق محض موہوم۔ لہٰذا واضح ہو گیا امروز فردا فی الواقعہ باہم متحد و پیوست ہیں اور ان کے درمیان تغائر یہ محض وہم کرنے والا کا وہم ہے۔

ہم جب فلسفہ کے اس بیان کہ ''روز و شب کہ وصف اتحاد و

فصل ان میں مشترک اور امر فاصل ان کے درمیان صرف ایک وہم ہے" کو امروز و فردا کے متعلق مذکورہ الصدر تقریر یعنی فردائے مطلق جب تعین خاص سے متعین ہو کر موسوم باسم امروز ہو جائے تو فردا ہی عین امروز ہو جاتا ہے" پر منطبق کریں تو یہ نتیجہ روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں " فردا سے مراد مطلق زمانہ اور امروز سے مراد صرف ایک موہوم تعین ہے جس کو اسم امروز سے موسوم کیا گیا ہے"۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ شعر بالا میں شاعر ممدوح کی مراد (جس کا اشارہ وہ اپنے آئندہ شعر میں دے رہا ہے) یہی ہے کہ " حیات من اپنی تعین خاص کی وجہ سے حیات اخروی کے ظہور کے منافی ہوئی اور اس نے حیات حقیقیہ کو اس طرح اپنی تحویل و تصرف میں لیا کہ خود حیات مطلقہ میری حیات کے تعین کے پردوں میں محجوب و مستور ہو گئی ہے۔

اس لئے حضرات صوفیاء کے نزدیک " ہویت حق" یعنی صرف حق تعالیٰ ہی ہے جو جمیع موجودات کا عین ہے"۔

شیخ اکبر علیہ الرحمہ کا نقطہ نظر:

مثلاً حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "فصِ سلیمانیہ" میں کہا ہے۔ کہ وہ منظر ابھی ہمارے سامنے ہے کہ اس ذات بے مثل و بے مثال ہے " لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ " کوئی نہیں اس کی مثل، فرما کر اپنی ذات سے ہر طرح کی مثلیت کی نفی فرما دی ہے۔ کیونکہ مثلیت تو

غیروں کے درمیان ہوتی ہے اور یہاں تو حال یہ ہے کہ وہ خود ''عین''
پرستی کا۔ کیا اس نے ''وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ'' وہی سننے والا ، دیکھنے
والا،فرما کر اپنے آپ کو ایسی صفات سے متصف نہیں فرمایا جو ہر جاندار
سامع اور بصیر میں عام ہیں۔ البتہ یہ امر پیش نظر رہے کہ اس ذات کی
صفات کی یہ عمومیت بطور افادہ ہے بطور استفادہ نہیں اور ماسویٰ اس کے
ہر سامع ہر بصیر کی سماعت و بصارت کا انحصار اس ذات حق کی ہے مثل
قوت سماعت و بصارت پر ہے۔ گویا آیت درج ذیل کا مضمون اس کو
اورنکھار کے بیان فرماتا ہے۔ ارشاد ہے۔ وَمَا هٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا اِلَّا
لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ط یہ
حیات دنیا سوائے کھیل و تماشہ کے کچھ نہیں اور حقیقی زندگی تو دار آخرت
کی زندگی ہے۔ اے کاش کہ وہ (اس حقیقت) کو سمجھیں۔

اس لئے شاعر ممدوح بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ہائے افسوس!
میرے حال پر کہ ہم حجاب انانیت کی دہلیز تہہ کی وجہ سے اس حقیقت کو
نہیں سمجھ پائے کہ حسنِ حیات، حیات آخرت میں محصور ہے جو حیاتِ
دنیا محضہ کے ابطال کا متقاضی ہے۔

نیز یہ واضح ہوا کہ وہ حیات جو ہم اپنے نفوس میں محسوس کرتے
ہیں اور اسے اپنی اصل زندگی تصور کرتے ہیں یہ حقیقت میں وہی حیات
حقیقی ہے ہو توہمات و اشغال دنیوی کے سبب ہم سے اوجھل اور حقیقت
سے محجوب و متفارق ہو گئے۔ چنانچہ حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کا فرمودہ

اس پر بین شہادت ہے۔ کہتے ہیں۔

میانِ عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست

تو خود حجاب خودی حافظؔ از میاں برخیز

یعنی عاشق و معشوق میں کوئی چیز حائل ہے اور نہ ہو سکتی۔ اے حافظ تو خود ہی حجاب خودی ہے لہٰذا تو درمیان سے نکل۔

حضرت الشیخ ملا جامیؔ کا فرمودہَ بھی مؤید ہے۔

ہستی تُست حجاب تو وگرنہ پیداست

کہ بجز دوست دریں پردہ نہاں چیزے نیست

یعنی تیری اپنی ہستی (انانیت) ہی تیرے سامنے بہت بڑا حجاب ہے ورنہ تو ظاہر ہے کہ اس پر وہ حقیقت کے اندر سوائے معشوق (حقیقی) کے کوئی اور ہے ہی نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ حیات دنیا یا وہ حیات جسے ہم اپنے نفوس میں پاتے ہیں یہ حیات حقیقی نہیں بلکہ اہل حق نے اسے غفلت عن الحق اور حجاب اکبر شمار کیا ہے اور یہی حجاب و غفلت اور انانیت ہے جسے عندالاصفیاء خالص دنیا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چنانچہ شیخ رومی علیہ الرحمہ نے کس قدر واضح کہا ہے۔

چیست دنیا؟ از خدا غافل بُدَن

نے قماش و نقرہ و فرزند وزن

یعنی دُنیا کیا ہے؟ یہ سونے، چاندی، بیوی بچوں کا نام نہیں بلکہ ''دنیا'' اللہ سبحان سے غافل ہونے کا نام ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا (اگر

بشعور دیکھا جائے تو) موجودہ حیات جسے ہم اپنے سانسوں میں محسوس کرتے ہیں یہی حیات حقیقیہ، اخرویہ کا عین ہے۔ (سو اس کا سنورنا آخرت کا سنورنا اور اس کا بگاڑ آخرت کی بربادی ہے) اور نیز یہ کہ حیات دنیا صرف وہم، حجاب اور بے معنی انانیت ہے۔

مکتوب شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی:

چنانچہ ہم حضور خواجہ مخدوم شاہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی علیہ الرحمہ کی ''صحائف السلوک'' سے ان کا ایک مکتوب نقل کرتے ہیں جو ہمارے موقف صواب کا مؤید اور شاہد عادل ہے۔

نقل مکتوب شریف حضرت خواجہ مخدوم نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

بنام یکیاز طالبانِ حق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خواہی کہ سخن زجان آگ شنوی
و اسرار در و نئے شہنشاہ شنوی

اے جانِ عزیز۔ اگر تم حقیقت جاں سے آگاہی بخشنے والی بات اور شہنشاہ حقیقی کے اسرار و بھید سے لبریز نغمہ جان فزاء سننا چاہتے ہو۔

گم گرد زخویش تا تواز ہستی خود
بیخود ہمہ ''انـــــی لا الـــــلّٰـــــہ'' شنوی

تو پھر اپنی ہستی موہوم یعنی بے حقیقت انانیت سے نکل تاکہ تجھے از ہر

سو، ہر ہر شے سے ''اننی انا اللہ'' کا سرور سرمدی سمع نواز ہو۔

''اے پیارے (اللہ تعالیٰ اپنی روح خاص سے تمہاری تائید فرمائے) بغور سینئے کہ بندہ جب اپنی انانیت اور خود ساختہ توہمات سے نکل کر ذات باری تعالیٰ میں محو و مستغرق ہو جاتا ہے تو اسے ذات حق سے ایک خاص صفت ''اتحاد'' میسر آ جاتی ہے۔

لیکن یہ مت سمجھنا یہ اتحاد (جس کی ہم بات کر رہے ہیں ان دو چیزوں کے اتحاد کی طرح کہ وہ دونوں ایک جگہ اکٹھی ہو جائیں تو ہم کہتے ہیں وہ متحد ہو گئی ہیں۔ جیسے کہ شیر و شکر کا آپس میں ملنا۔ یعنی بظاہر اگرچہ دونوں ایک ہو گئی ہیں مگر ان میں باہمی مغائرت بہرحال باقی ہے) کہ شیر، شیر ہے اور شکر، شکر ہے، لیکن خبردار! یہ فلسفہ اتحاد (جو ہم آپ کو سمجھانا چاہ رہے ہیں اس اتحاد سے مراد یہ ہے کہ ہر ایسے دو ایک ہو جاتے ہیں کہ ان کے درمیان مغائرت اٹھ جاتی ہے۔ مثلاً یہی انانیت دنیا جب اس کی ذات میں فنا ہو جاتی ہے تو وہ خود ہی سب کچھ ہو جاتی ہے۔ پس جب بندہ اس مقام احدیت پر سرفراز ہوتا ہے تب ہی کلمہ ''لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ'' اس سے درست ادا ہوتا ہے اور اس کی حقانیت کلی اور جلوہ نما ہوتی ہے۔ اور وہ ''کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ'' یعنی اللہ کے سوا جو کچھ ہے سب فنا پذیر اور باقی صرف ذات حق ہے۔ صاحب عزت و بزرگی کی حقیقت کو بھی پا جاتا ہی۔

جواں مردا! بغور دیکھ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ: لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا۔ جب اس کے رب نے سوئے جتنی تجلی فرمائی تو وہ پارہ پارہ ہوگیا اور جناب موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے یہ کیا ہے؟ اے عزیز من! کچھ سوچ۔ اِنِّیْ اٰنَسْتُ نَارًا یقیناً دیکھا ہے میں نے آتش (شوق) کو میں کون جلوہ نما تھا؟ اور مزید توجہ کیجئے فَلَمَّا اَتٰھَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِیِٔ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰی اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کہ جب سیّدنا موسیٰ علیہ السلام اس کے نزدیک پہنچے تو وہ وادی جو بقعہ مبارک میں تھی کے راست کنارہ سے آپ کو ایک درخت سے ندا ہوئی" اے موسیٰ علیہ السلام میں ہی ہوں، "اللہ" پروردگار تمام جہانوں کا۔ یہ کیا ماحول تھا؟ کیا جلوہ تھا؟ اے عزیز من! سچ یہ ہے کہ --- وادی ایمن جناب کلیم کا سینہ اقدس۔ بقعہِ مبارکہ آپ کا مبارک دل، شجر عظیمہ، ان کی جان عزیز اور انی انا اللہ" اس کا نمبر لذیذ تھا۔

پس بتحقیق معلوم ہوا اس وقت سب کچھ وہ ہی تھا یہ (جناب کلیم) کچھ نہ تھے۔ اب بغور ملاحظہ ہو۔ اَلْفَقْرُ اِذَا تَمَّ ،ھُوَ اللّٰه" کہ فقر جب کامل ہو جاتا ہے تو سب کچھ "اللہ ہی اللہ" ہوتا ہے ماسوی اللہ کچھ بھی نہیں۔

اے برادر عزیز ۔ یہاں سے یہ نہ سمجھا کہ جبل طور جو کہ پتھروں کا تھا اور جناب کلیم پر مدہوشی اس کی وجہ ہوئی۔ عزیز من یہ

شرف اس انسان(اور وہ انسان بھی عام نہیں اللہ کا نبی ہونے) کا ہے
کہ واسطہ کلام حق سنے اور اپنے محفوظ رکھنے کا بھی اسے حوصلہ و ہمت ملی
تو ایسے میں کیسے ممکن ہے کہ پتھروں سے اسے بیہوش کر دے۔

چنانچہ یہ مانو کہ یہ کلام بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا اور تجلی
بھی انہی کے دل اقدس پر پڑی تھی والسلام (حضرت مخدوم چراغ دہلوی
کا مکتوب پورا ہوا)۔

لہٰذا اس بحث کلام سے ثابت ہو گیا کہ انانیت (بے حقیقت
تکبر و غرور) چونکہ مغائرت کا سبب ہے اس لئے یہ اپنی ذاتی حیثیت
کے اعتبار سے بالکل معدوم ہے اور حیات موجودہ (اگر آخرت کی تیاری
کے لئے بسر ہو) تو یہی بعینہٖ حیات حقیقی ہے۔ یعنی نفس حیات فقط ایک
ہی شے ہے جو کہ شوئی قسمت سے میری انانیت میں) محجوب ہو گئی
تھی۔ جسے شاعر ممدوح مطلع میں بیان کر رہا ہے اور اس کی تخلیل اسی
بنیاد کی فرع ہے۔

دوسرا شعر

☆ یعنی میری انانیت (بے حقیقت ہستی و غرور و تکبر) یہ تو قطعاً
معدوم ہے کیونکہ یہی انانیت ہے جو ظلمت (وجود) کے سایہ میں صبح محشر
کی پرورش یافتہ ہے حالانکہ اس میں وجود یعنی نور کا شائبہ تک نہیں
ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حیات دنیوی بعینہٖ حیات حقیقی اُخروی ہے
لہٰذا جو امر حیات دنیا کی جناب منسوب ہو گا (یعنی نیکی یا برائی) وہی

حیات اُخروی کی طرف منسوب ہو گا۔ لہٰذا دنیوی زندگی کی بہتری آخرت کی بہتری اور خسران حیات دنیوی خسران آخرت ہے۔ سو شاعر کا اپنے اعمال دنیا پر تاسف کا اظہار اس کی اس ندامت و حسرت کو ظاہر کرتا ہے جو اس کے باطن میں سمائی ہوئی ہے اور یہی ندامت دراصل علم و معرفت کا دوسرا نام ہے۔ جس کا لازمی ثمر ظلمت عصیاں کا خاتمہ، انکشاف حقائق (روحانیہ و باطینہ) ، جلائے قلب اور معرفتِ حق جل شانہ ہے۔

تیسرا شعر

☆یعنی اشعار بالا سے ہرگز یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ میں ظلمت عصیان کے سبب حق تعالیٰ سے محجوب، ومہجور ہو کر محض اہل ظہور بر کا متبع ہو کر رہ گیا ہوں۔ جن کے بارے کہا گیا ہے۔ ''یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ۔ یعنی وہ تو ظاہر دنیا ہی کو اصل متاع سمجھ بیٹھے اور آخرت سے بالکلیہ غافل ہو گئے ہیں''۔

نہیں! بلکہ (اللہ کے فضل سے) میں ان تائبین میں سے ہوں اور کاملین کا پیرو کار ہوں جن کی شان میں آیا ''اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ'' (تائب تو ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں) نیز جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ''رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ''(وہ ایسے لوگ ہیں کہ کوئی خرید و فروخت (مال دنیا) انہیں یادِ حق سے غافل نہیں کر سکتا)۔ سو انہیں پاکبازوں کی اتباع

و اطاعت نے مجھے ہر ما سویٰ اللہ سے استغناء اور اس کی قربت و محبت کی نعمت سے سرفراز کر دیا ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ نے واضح کہا ہے کہ ''فَاتَّبِعُوْانِی یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ''۔ اللہ نے اپنے محبوب سے کہلوایا کہ تم میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائے گا۔ پس میں بھی (بحمد اللہ) حضور پر نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)اور صلحاء کی اطاعت و فرمانبرداری کی برکت سے مقرب و محبوب حق ہوں، مہجور و محجوب نہیں۔

چنانچہ حدیث شریف آیا ہے ''مَنْ ذَکَرَنِیْ فَاَنَا جَلِیْسُ لَہٗ ''۔ یعنی جس نے مجھے یاد کیا میں اس کا ہمنیش ہوتا ہوں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انکشاف حقائق ،معرفت و قرب حق جو حق تعالیٰ ہی ہمنشینی اور محبوبیت کا لازمی ثمر ہے اور وہ اپنی محبوبیت کے ان اسرار و رموز کو ہم پر ظاہر نہ فرمائے۔ (فللّٰہ الحمد علی ذالک)

☆گرامی نے مذکورہ بالا شعر (بردر حرف آشنایاں سرنمی آرد فرود۔ کوس معنی زد اب بربام استغنائے مَن) میں ''حرف'' کے مقابل ''ادب'' کا لفظ استعمال کیا ہے یہ اس جانب اشارہ ہے ''حرف'' جو کہ فی نفسہٖ ایسا کلمہ ہے جو اپنا معنی خود واضح نہیں تاوقتیکہ اس کے کوئی فعل کلمہ یا اسم کلمہ نہ ملے۔ یہی مثال محض حرف گیروں کی ہے۔ جو اپنے آپ سے بے خبر اور محض دوسروں پر نقطہ چینی کو اپنے لئے تفوقِ علمی جانتے ہیں۔ شاعر نے ان کے مقابل لفظ ''ادب'' سے واضح کیا کہ اصحاب ادب جو

کہ حقیقتِ معنی کے شناسا اور دانا ہوتے ہیں لہٰذا ''حرف'' کے مقابل ''ادب'' کی اصطلاح کے استعمال سے شاعر ممدوح کا حسن کلام اور آتش بیانی جس کمال سے ظاہر ہے؟ محتاج بیان نہیں۔ بس، آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

چوتھا شعر

☆ نعرہ حق ''انا الحق'' کی پاداش میں بہا گیا آپ کا خون آج میری زبانِ قال و حال سے ٹپک رہا ہے

چونکہ میری ہستی نے اپنے من میں شاہ منصور حلاج علیہ الرحمہ کے ذوق و مستی کو سمو لیا ہے اس لئے اور یہ مفہوم مکتوبات شریف میں اور وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ وہ ندائے سرمدی جو جناب موسیٰ علیہ السلام نے طور پر شجر مقدس سے سنی تھی اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ شجر مقدس دراصل آپ کی جان عزیز تھی اور ''انی انا اللّٰہ '' کی صدائے حق اس کا ثمر تھی۔ پس متحقیق ثابت ہوا کہ ''ہمہ اوبود نہ ایں'' سب کچھ وہی ہے یہ (وجودِ من) کچھ بھی نہیں۔ یہی معنی ہے۔ ''اَلْمفقُدُ اِذَا تَـمَّ، هُوَاللّٰه '' کا یعنی فقر جب کامل ہو جاتا ہے تو بس ''اللہ ہی اللہ ہوتا ہے اور ماسوی اللہ کچھ نہیں رہتا۔

یہاں یہ بھی واضح ہوا ''اگر حق تعالیٰ جمیع موجودات کا عین نہیں تو پھر تمام اشیاء کا اس کی جانب لوٹنے کا کیا معنی؟ کیونکہ کسی چیز کے بارے ''رجوع'' کا تصور اُسی وقت درست مانا جا سکتا ہے جب اپنے

اس اصل کی جانب پلٹے جہاں سے اس کا وجود برآمد ہوا۔ ورنہ ''رجوع'' چہ معنی دارد۔لہٰذا یہ کہ تمام موجودات کا عین خود حق تعالیٰ ہے یہ ''رجوع الی اللہ'' اس کی سب سے بڑی اور واضح دلیل ہے کیونکہ دلیل ''رجوع'' کل اشیاء عالم میں موجود اور بین ہے۔

☆ شعر مذکور میں شاعر کا یہ دعویٰ کہ خونِ ''انا الحق'' آج میرے لبوں سے ٹپک رہا ہے اس پر غور کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر ان کا یہ دعویٰ ''انا الحق'' برائے نفی ''انا الحق'' یعنی اپنے وجود کی نفی کے لئے ہوتا تب تو موزوں تھا۔ لیکن یہاں تو وہ نفی خویش کی بجائے قصہ منصور سے سند پکڑتے ہوئے ثابت کر رہے ہیں کہ وہ خون جو نعرۂ ''انا الحق'' کی پاداش میں شاہ منصور سے بہا تھا وہ آج میرے لبوں سے جاری ہے تو یوں ''انا الحق'' کا یہ دعویٰ کرنا، یہ وجود خویش کا اظہار ہے۔

بایں وجہ شعر میں لائے گئے الفاظ ان کے مدعا و مقصود (عدم وجود خویش) سے بظاہر مطابقت نہیں رکھتے۔ اِلا یہ کہ اگر بنظر غائر دیکھا تو ایک نہایت ہی لطیف سی توجیہہ جو کہ باذوق ارباب بلاغت سے مخفی نہیں ہے کی بنیاد پر شعر میں مذکور الفاظ درست قرار دے جا سکتے ہیں۔

پانچواں شعر

☆ اس شعر کے تناظر میں حضرت شارح علیہ الرحمہ کی توضیحات اپنی جگہ ایک وزن رکھتی ہے لیکن اس کی آسان وضاحت یہ ہے۔ ''نفی اثبات مرا، اثبات نفی من دلیل'' یعنی نفی اثبات مرا، اپنے اصل یعنی

اثبات کی من جانب کی رجوع کی اسی طرح دلیل ہے جس طرح کہ ''لا'' یعنی نفی کا معنی ''اِلا'' یعنی اثبات میں جوش زن ہے۔ یا با لفاظ دیگر کہ جب ذکر''لَا اِلٰہَ'' اپنی اثبات کی نفی کرتا ہے اور''اِلَّا اللّٰہ'' سے وجودِ حق کا اثبات کرتا ہے تب وہ بنظر شہود اپنے آپ کو عین حق دیکھنے لگتا ہے۔ پس یہی ''اثبات حق'' جو''اِلَّا اللّٰہ'' سے ثابت ہوا ہے دلیل روشن ہے میرے اپنے اصل کی جانب رجوع کرنے کی۔

نواں شعر

☆☆ بعد از انتقال انبیاء علیہم السلام اور صلحائے اُمت سے اکتساب فیض اور ان کی ارواح و مراقد مقدسہ کا فیض رساں ہوتا یہ مسئلہ اپنی جگہ ثابت ہے اور نفس الامری میں واقع بھی ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس کے ثبوت کا علم اور وقوع ایسا بدیہی امر ہے کہ خواص و عوام میں کوئی بھی اس کا انکار نہیں کرے گا۔ الا یہ کہ کسی کے دل میں ایسے مقام میں فساد و مکابرہ کا مرض پیدا ہو چکا ہو۔ چنانچہ اخبار متواترہ حسن صحیح روایات اس کے ثبوت اور وقوع کے شاہد ہیں۔

صوفیاء عظام کا ایک ممتاز طبقہ، طائف اویسیہ کے حضرات نے بعد از وصال انبیاء علیہم السلام اور صلحاء سے فیض حاصل کیا اور برابر کرتے ہیں چنانچہ شیخ الشیوخ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی علیہ الرحمہ کی روح پرفتوح سے سلطان العارفین حضرت شیخ سیّدنا بایزید بسطامی علیہ الرحمہ کا فیض پانا تو ان حضرات کے نزدیک ایک مسلم حقیقت اور دلیل

قطعی کے درجہ میں ہے۔

شیخ المحدثین شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جذب القلوب میں اور امام تاج الدین السبکی علیہ الرحمہ نے شریعت مطہرہ کے اصول اربعہ کی روشنی میں حضور سیّد عالم امام الرسل حضرت سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت و قربت کے فضائل کے بیان میں اس مسئلہ کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔

جبکہ کتاب اللہ میں حق سبحانہ کا ارشاد ہے۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ جَاؤُكَ وَا فَاسْتَغْفِرُو اللّٰه وَاسْتَغْفِرَلَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوْا اللّٰهَ تَوَّبًا رَّحِيْمًا O اور اگر وہ (ارتکاب معاصی سے) اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو وہ آپ کے دربار میں حاضر ہوں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں اور یہ رسول بھی ان کے لئے اللہ سے معافی طلب کرے تو وہ ضرور پائیں گے اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے۔

بارگاہ رسالت پناہ میں حضوری کی ترغیب و تحریص اور آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اجابت مآب بارگاہ اقدس سے سوال مغفرت اور طلب استغفار کی بین دلیل ہے۔ اور اس بارگاہ عظیمہ کا یہ رتبہ کبھی انقطاع پذیر نہیں ہوگا جیسے آپ کی حیات ظاہری میں قائم تھا ایسے ہی بفضل اللہ العظیم بعد از وصال بھی قائم و دائم رہے گا۔

نیز بر روایت حضرت سیّدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی " مَنْ زَارَ قَبْرِىْ بَعْدَ مَوَاتِىْ

مُوْدِیْ فَکَاَنَّمَا زارتی تی حیاتَ وَمن لم یزر قبری فقد جفانی ۔ جس نے میرے مرقد انور کی زیارت میرے انتقال کے بعد کی گویا اس نے میری حیات میں زیارت کی۔ اور جس نے میری قبر انور کی زیارت نہ کی گویا اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ اور حضرت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تعامل یہ سب شواہد بعد از وصال اکتساب فیض کے شاہد عادل ہیں۔

چنانچہ جذب القلوب شاہ عبدالحق دہلوی میں منقول ہے کہ امیر المومنین حضرت سیّدنا ابو الحفص عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کی فتح کے بعد جب وہاں کے اہل کتاب سے معاہدہ سے فارغ ہوئے تو مشہور صحابی سیّدنا کعب احبار جو اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے۔ حاضر خدمت ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے تو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جناب کعب احبار کے اسلام قبول سے غایت درجہ فرحت و سرور نصیب ہوا۔ آپ نے بوقت مراجعت کعب احبار کو فرمایا۔ کعب! کیا تم ہمارے ساتھ مدینہ منورہ نہیں چلو گے کہ سرور انبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی زیارت کا شرف پاؤ۔ انہوں نے کہا امیر المومنین میں آپ کے ساتھ مدینہ منورہ ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت کعب احبار کو ہمراہ لے کر مدینۃ النبی میں فروکش ہوئے تو سب سے پہلے جو کام سرانجام دیا وہ کعب کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کے درِ اقدس کی حاضری تھی یوں خلیفہ رسول ، امیر المومنین کا حضرت کعب احبار کو قبر شریف محبوب خدا کی زیارت اور اس

سے فیض حاصل کرنے کا حکم فرمانا اور پھر مدینہ طیبہ میں وارد ہونے کے بعد تمام اُمور سے پہلے مرقد انور کی زیارت سے مشرف ہونا محض بے فائدہ عمل تو نہیں بلکہ یہی استفاضہ و استمداد اور استفاضہ از قبر شریف شریف آپ کا مقصود اولین تھا۔ اور بالعقیدہ قبر شریف کی زیارت پر واقعہ اور قول، من جملہ ان اقوال و واقعات کے ایک ہے۔ جو قرنِ اوّل یعنی دور صحابہ علیہم الرضوان میں رونما ہوا۔ جبکہ قرنِ ثانی میں بھی ایسی شہادتیں ملتی ہیں جو (بالقصد) زیارت قبر شریف اور اس کے مکین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب میں سلام و پیام بھیجنے کو ثابت کرتی ہیں۔

چنانچہ جذب القلوب میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ نقل کرتے ہیں مشہور اموی خلیفہ حضرت سیّدنا عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شام سے قاصد کو بھیجا تاکہ وہ ان کا سلام و نیاز بحضور رسالت پناہ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم عرض کرے۔ آپ کا یہ عمل حضرات تابعین کے دور میں واقع ہوا جب کبار تابعین کی ایک کثیر جماعت موجود تھی۔ اور مزید برآں یہ کہ استفاضہ از قبر شریف آنجناب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ روایت اور عمل خواص و عوام میں مشہور و متعارف تھا۔

اور قرنِ ثالث بھی ان شہادتوں سے مالا مال ہے، چنانچہ شیخ محقق علیہ الرحمہ نے یہی ''جذب القلوب'' میں بیان کیا کہ امام عبداللہ شافعی علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ حضرت سیّدنا امام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کا مرقد پرانوار ''تریاق اکبر'' ہے کہ جہاں بطور خاص دُعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور ابن حجر کے قلائد الجواہر میں امام الائمہ سیّدنا امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے حالات کے ضمن میں لکھا ہے۔'' اعلم انہ لم یزل العلماء و ذوالحاجت یزورون قبوہ ویتوسلون عندہ فی قضاء حوائجھم متھم الامام الشافعی ''۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اہل علم اور اہل حوائج ہمیشہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی قبر انور پر حاضر ہوتے زیارت کرتے اور آپ کے توسل سے اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں اپنی حاجات کی برآوری کی دُعائیں کرتے چنانچہ حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ بھی ان اہل علم وفضل میں شامل ہیں۔

سند المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ نے اپنی تفسیر عزیزی میں آیۃ مبارک'' وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ '' کے بیان کیا ہے کہ اولیاء عظام میں ایک مخصوص طائفہ اولیاء کا ایسا بھی ہے جو آپ کو بنی نوع انسان کی حاجات تکمیل اور رشد و ہدایت کے لئے آلہ جارحہ قرار دیتے اور عالم دنیا میں لوگوں کی معاملات میں تصرف فرماتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ تصرف فی الدنیا کا شغل ان کے لئے استغراق بالحق اور ان کے وسعت مدارک میں مانع نہیں ہوتا۔ خصوصاً سلسلہ اویسیہ کے صلحاء نے تو اس طریقہ تصوف کے ذریعے کمالات باطینہ کی تحصیل میں بہت ہی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جن کی وجہ سے بہت سے ارباب حاجات اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لئے اور جن متلاشی ان کے

طالب صادق ہوئے اور پھر مراد کو پہنچے اور پھر کیف و سرور کی مستی یہ کہتے سنائی دیتے۔ ''من آئیم بجاں گر تو آئی بتن''۔

مولوی اسماعیل دہلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنی کتاب منصب امامت میں مسئلہ اعانت از اولیاء بعد از قید حیات کو ثابت کیا ہے، چنانچہ ''صحبت امامت خفیہ'' کے ضمن میں ان کا کہنا ہے ''امور شریعت کے علاوہ امور تکوینیہ میں وصول فیض کے لئے عکسی کامل شخص کا واسطہ لازم ہے یعنی دانا آدمی مطلقا ان حضرات کو جملہ اُمور کونیہ میں متصرف مانتا ہے۔ مثلاً کہ بارشوں کے نزول استجار و نباتات کی شادابی، انسانی آبادیوں، جانوروں اور جنگلی حیات کی بقاء، ملکوں کے شہروں اور قریہ جات میں تبدیلیوں کا رونما ہونا یونہی ان کے سلاطین و اُمراء میں اقبال و ادبار کا ظہور، اغنیاء و مساکین میں غناؤ مسکنت کا تبدل، اکابرو اصاغر میں ترقی و تنزلی، جنود و عساکر میں جمعیت و افتراق جب وباؤں اور بلّیات کا دقیعہ اور خیر و برکت کے نزول جیسے اوقات و معاملات اور ان جیسے دیگر اُمور تکونیہ میں اولیاء کاملین اُمت کا تصرف جاری رہتا اور موثر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے بطور واسطہ و وسیلہ ان سے توسل و توسط حین حیات اور بعد از حیات درست ہے (بشرطیکہ ہر ایک امر میں موثر حقیقی اللہ تعالٰی کو ہی یقین کیا جائے اور سبب کے درجے میں حضرات ان کے تصرف روحانی سی بھی توسل کر لیا جائے۔

☆☆☆☆

دسواں شعر

☆ حضرت شیخ شارح علیہ الرحمہ نے گرامی کی اسی مضمون (مرقد و رہبر کی ضرورت) پر مشتمل ایک دوسری غزل کے چند اشعار بطور حوالہ شرح کے ذیل میں ذکر فرمائے ہیں جنہیں ہم شرح سے اُٹھا کر حاشیے میں بمعہ ترجمہ درج کر رہے ہیں تا کہ مضمون کا تسلسل متاثر نہ ہو (مترجم)

چنانچہ ملاحظہ ہوں۔

گم گشتنم از خویش زجائے خبرم داد
ایں گمرہی از راہنمائے خبرم داد

یعنی میں اپنی سرمستی و بیخودی میں خود بیگانہ کی اچانک اسی بیخودی و بیگانگی نے مجھے خود سے اور میرے راہنما و رہبر کے بارے میں آگاہ کیا۔

من بندۂ انداز زخود رفتن خویشم!
کیں بیخودی، از خانہ خدائے خبرم داد

(یہ سچ ہے) کہ میں سر راہ پڑا، خود سے بیگانہ ایک بندۂ بے نام تھا کہ اسی بیخودی و بے نامی نے مجھے اللہ کی راہنمائی کی۔

آمد بلب غنچہ تبسم شدم ازکار
انداز تبسم زادائے خبرم داد

(منزل مقصود یعنی خانہ خدا میں پہنچنے کے بعد خوشی و شادمانی سے) میرے خشک لبوں پر بھی تبسم کی کلی چٹکنے لگی اور میرے ساتھ مشغول ہو گئی اسی کے انداز تبسم نے مجھے ناز و ادا کی دلربا اداؤں سے آگاہ کیا۔

بارہواں شعر

☆ لفظ ''حورائے'' دراصل واحد ہے اور اس کی جمع ''حور'' آتی ہے۔ البتہ اہل فارس ''حور'' کا لفظ بھی بطور واحد استعمال کر لیتے ہیں تب اس کی جمع ''حوراں'' کے لفظ سے لاتے ہیں۔

چنانچہ سعدی شیرازی کے شعر میں مذکور ہے۔

حوران بہشتی را دوزخ بود اعراق

از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است

شاعر ممدوح اپنے شعر میں ''حورائی من'' کو جمع کی طور لائے ہیں حالانکہ یہ لفظ جمع کے طور مستعمل نہیں اور پھر ''حورائے من'' کا عطف، ''غلمان'' پر جیسا کہ شعر میں استعمال ہوا ہے یہ فصاحت کے خلاف اور بلاغت سے خالی نہیں رہا اگر ضرورت شعر کی وجہ ایسا کیا ہے تو محل جواز بنتا ہے سوائے اس کے کوئی اور توجیہ مشکل ہے او یہ اصحاب بلاغت سے مخفی نہیں۔

پندرھواں شعر

☆ ''گرامی تر نزادہ'' کا مفہوم حضرات شارع رمز شناس نے فرمایا اور دوسرا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔ کہ عرفی کا یہ کہنا کہ میرے خاندان میں مجھ سے ''گرامی تر'' یعنی ایسا ولد محترم جو سخنوری میں میرا ہم پلہ پیدا نہیں اس لئے ولد محترم میں ہوں البتہ اگر شعر کی ہیت ترکیبی پر غور کر لیا

جائے تو عرفی کا اپنے بارے حصر کا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔
چنانچہ عرفیؔ نے کہا ہے ''دودخان عشق را از من گرامی ترنزاد'' اس میں لفظ
''را'' پر غور کریں تو عبارت اس کا استعمال تین طرح سے کیا جاتا ہے۔
الف: بطور علامت مفعول مثلاً زید عمررا کشت۔ زید نے عمر کو قتل کر دیا۔
ب:۔ بطور علامت اضافت۔ مثلاً زید اسپ زید۔ یعنی زید کا گھوڑا۔
ج:۔ بمعنی ''برائے'' جیسا کہ اس شعر میں مستعمل ہی۔ یعنی برائے خاندانِ عشق فرزندگرامی تراز من تلیت۔ مطلب یہ کہ ہمارے خاندان کے لئے مجھ سے زیادہ گرامیؔ (معزز) پیدا نہیں ہوا اس کا مطلب یہ نہیں کہیں اور کسی خاندان میں جنم نہیں لے سکتا ہے۔

یہاں ایک اور لطیف سا نکتہ پیش نظر رہے۔ وہ یہ کہ شعر میں مذکور نفی ''گرامی، تر'' کی نفی ہے۔ مطلق گرامیؔ کی توہین یعنی نفی ''تر'' کی قید پر ہے۔ مقید یعنی ''گرامی'' پر نہیں۔ لہٰذا معنی شعر بالکل صاف ہو گیا۔

سولہواں شعر

☆ ''یا معین! می ریزد ہر موئے درد آویز من'' شعر میں مستعمل الفاظ ''بریزد اور میجوشد'' پر غور فرمائیں۔ بریزد اور میجوشد، یہ دونوں صیغے بہتے چشمے کے پانی کے اوصاف میں سے ہیں۔ نیز شعر متذکرہ بالا میں ''یا معین، یعنی اے چشمہ جاری! یہ لفظ اپنی معنوی اور لفظی حیثیت سے

حضور خواجہ غریب نواز کے اسم مبارک ''معین'' سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ اس لئے یہ مناسبت خاص اپنے اندر لطف آں شیخ علیہ الرحمہ کو متوجہ کرنے اور توارِدِ مضمون کا حسین امتزاج ہے اس شاعر نازک خیال کی طبع سخن گوئی میں نادر اور عجیب تخیل نے جنم لیا اور پھر اشعار کی صورت میں ڈھل گئی۔ چنانچہ ایسا تو اصحاب کلام کے نزدیک خاص عطیہ خداوندی اور خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی روحانی برکت ہے ورنہ کسی سے ایسی نازک خیالی حاصل ہی کہاں ہوتی ہے۔

☆☆☆☆

بسی کے تاجور

از سائیں نذیر حسین فریدی

رہبر ہو، راہنما ہو بسی کے تاجور
ہادی ہو، پیشوا ہو بسی کے تاجور

تیرا وجود مرکزِ برکات ہے سدا
اللہ کی عطا ہو بسی کے تاجور

راہِ شرح پہ اُٹھتا تھا آپ کا قدم
سرکار میں فنا ہو بسی کے تاجور

طریقت کے راز داں ہو میرے فرید العصر
حقیقت سے آشنا ہو بسی کے تاجور

اللہ کی معرفت ہے ہر آن آپ کو
عرفاں کے میکدہ ہو بسی کے تاجور

گنج شکر کی ذات میں گم تیری ذات تھی
معین کے گدا ہو بسی کے تاجور

نظر کرم ادھر ہو بہر فرید الدین
دل کی میرے جلا ہو بسی کے تاجور

صدقہ محمد شاہ کا نظر کرم خدارا
ابو النصر کے پیا ہو بسی کے تاجور

فریدؔی پہ فیض آپ کا سایہ فگن رہے
سرتاپا عطا ہو بسی کے تاجور

☆☆☆☆

نذرِ عقیدت

درخدمتِ اقدس حضرت خواجہ میاں علی محمد خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
سجادہ نشین حضرت خواجہ محمد شاہ صاحب چشتی نظامی فخری

بسی شریف

اے کہ تو ہے کُنتُ کَنزًا مَخفِیًا کا راز دار
اے کہ ہے فقر و غنا کی مملکت کا تاجدار

از طفیلِ شاہِ طیبہ ؐ نہ فلک در آستیں
مہر و اختر دریمین و ماہ انجم دریسار

ایک دیرینہ تمنا خواجگانِ چشت کی
اک نیا اسلاف کی عظمت کا تابندہ وقار

خواجہ اجمیر کی شمع شبستان کی ضیاء
گوہر مقصودِ قطب الدین کاکی بختیار

بُلبلِ شیریں نوائے باغ وبُستان فرید
اور محبوب الٰہی کے گلستاں کی بہار

نُور کی بارش رُخ حسن صباحت بار پر
دل سے دُھل جاتا ہے جس کو دیکھ کردل کا غبار

مہر و لطف و فیض کا دریا نظر میں موجزن
قلب میں جود و سخا کا بحرنا پیدا کنار

اک تبسم لب پہ، ماتھے پر دمک خورشید کی
روئے تاباں چودھویں کے چاند کا آئینہ دار

قدسیوں کے قلب کی اِک خوبصورت آرزو
دستِ نقاش ازل کا اِک نرالا شاہکار

صبح روز اولین کے مہر کی پہلی کرن
جس نے روشن کر دیئے تاریک سینے بے شمار

میں کہ جس کی زندگی اک پیکر آلام ہے
جس کو راس آیا نہ انعام حیات مستعار

اک سراپا درد ہوں، ایک یاس کی تصویر ہوں
حسرتوں کا ایک مدفن، آرزوؤں کا مزار

شدتِ احساسِ غم سے اب جیا جاتا نہیں　　دامنِ صبر و سکوں بھی ہو چکا ہے تار تار

دور کر لطف و کرم سے رُوح کی بے تابیاں　　التجا اتنی ہے خدمت میں بعجز و انکسار

تو اگر چاہے تو پھر جائیں یہ رُخ حالات کے　　تو اگر چاہے تو ہو جائے زمانہ ساز گار

تو جو چاہے تو بدل دے باطنی کیفیتیں　　تو اگر چاہے تو ہو آئینہ دل تابدار!

تو اگر چاہے تو زہرہ ہو زحل کے برج میں　　تابع فرماں ہے ترے گردش لیل و نہار

ازرہ لطف و کرم عالم بنیں، حالم بریں　　تابیاید جان زارو بے قرارم را قرار

سوئے من نظارہ کن، اے دیدہ رحمت نظر!　　بردرت افتادہ است، ایں طالب عصیاں شعار

وہ طبیعت آسماں کو بھی جو سمجھے آستاں　　دل وہ دل جو خواجہ محمد شاہ پر نثار

اُستاد لبھو رام جوشؔ (ملسیانی جالندھری)

☆☆☆☆

تمت بالخیر

سہ ماہی فخر جہاں

- فخر جہاں۔ تعلیمات اسلامیہ کا حقیقی ترجمان ہے۔
- فخر جہاں۔ الحاد و بے دینی کو روکتا ہے۔
- فخر جہاں۔ نوجوان طلباء کے لئے بہترین معلم ہے۔
- فخر جہاں۔ تشنگان معرفت کے لئے جامِ عرفاں ہے۔
- فخر جہاں۔ اصلاح خواتین کے لئے خاموش مبلغ ہے۔
- فخر جہاں۔ مسلمانوں کے قلب میں ایمانی جذبات پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔
- فخر جہاں۔ اصلاحی دینی مضامین کا بلند پایہ کیف آور نعتوں سے بھرپور گلدستہ ہے۔
- فخر جہاں۔ امن انسانیت، پیغام محبت اور حریت فکر ونظر کا داعی خلوص ومحبت ہمدردی اور اُخوت کا پیغام ہے۔
- فخر جہاں۔ ملت اسلامیہ کا علمی روحانی، نورانی اور ایمانی مجلہ بیادگار سلسلہ چشتیہ نظامیہ حضرت مولانا محمد فخر الدین فخر جہاں دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
- فخر جہاں۔ عوام وخاص میں روحِ عمل اور جذبہ بیدار کر رہا ہے۔

فخر جہاں کے دائمی سرپرست صاحبزادہ میاں محمود احمد خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تھے ان کے صاحبزادے میاں داؤد احمد خاں سجادہ نشین صاحب ہوئے ان کی سرپرستی میں متعدد کتب ورسائل بھی شائع ہوئیں۔

اگر آپ فخر جہاں میں مندرجہ بالا خصوصیات پائیں اور ادارہ کی دینی وروحانی خدمات آپ کو پسند ہوں تو آج ہی سالانہ چندہ 500 روپے جمع کروائیں اور اپنے احباب حلقہ اثر میں اس کی اشاعت میں معاونت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے۔

آمین

اللہ محمد چار یار
بسم اللہ الرحمن الرحیم
حاجی خواجہ قطب فرید
قطب الوقت فرید العصر شمس الفقراء و بدر الفضلاء
مرشدنا حضرت الحاج خواجہ میاں علی محمد خان چشتی نظامی فخری ہوشیار پوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
مدفون درگاہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پاکپتن شریف
کتاب راہِ فردا کی
فارسی شائع ہو گئی
ہدیہ 300/- روپے
ناشر: فخر جہاں اکادمی نور شاہ موڑ اڈا گیمبر ضلع ساہیوال
حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
کی مایہ ناز تالیف
شرح وحدت الوجود والشہود
فخر جہاں اکادمی کی آئندہ پیشکش
رابطہ کیلئے: مکتبہ چشتیہ فریدیہ نور شاہ موڑ گیمبر اڈا ضلع ساہیوال
0313-6985585،0345-7526926